قومی نصاب ۲۰۲۳ء (نظرثانی شدہ) کے مطابق

اُردُو

11

PECTAA
Transformation, Innovation and Excellence

پنجاب ایجوکیشن، کریکولم، ٹریننگ اینڈ اسسمنٹ اتھارٹی

جملہ حقوق (کاپی رائٹ) بحق پنجاب ایجوکیشن، کریکولم، ٹریننگ اینڈ اسسمنٹ اتھارٹی، لاہور محفوظ ہیں۔
یہ کتاب پنجاب ایجوکیشن، کریکولم، ٹریننگ اینڈ اسسمنٹ اتھارٹی، لاہور کی تیار کردہ ہے۔ تحریری اجازت کے بغیر اس کتاب کا کوئی حصہ کسی امدادی کتاب، خلاصہ، ماڈل پیپر یا گائیڈ وغیرہ میں شامل نہیں کیا جاسکتا۔

مؤلفین

ڈاکٹر محمد خاور نوازش
شعبۂ اُردو، بہاءالدین ذکریا یونیورسٹی، ملتان

پروفیسر طارق حبیب
شعبۂ اُردو زبان و ادب، یونیورسٹی آف سرگودھا، سرگودھا

پروفیسر محمد ظفرالحق چشتی
صدر شعبۂ اُردو (ر)، گورنمنٹ ایم اے او کالج، لاہور

محمد طاہر صدیقی
سینئر ماہر مضمون (ر)، پنجاب ایگزامینیشن کمیشن (کالعدم)، لاہور

رانا حنان محمود
شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف نارووال، نارووال

اراکینِ ریویو کمیٹی

ڈاکٹر ذی شان تبسم
شعبۂ اُردو، اسلامیہ یونیورسٹی، بہاول پور

ڈاکٹر میر یوسف میر
چیئرمین شعبۂ اُردو، یونیورسٹی آف آزاد جموں و کشمیر، مظفر آباد

ڈاکٹر آصف علی چٹھہ
صدر شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ایم اے او گریجویٹ کالج، لاہور

ڈاکٹر حمیرا صادق قریشی
فیڈرل گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج، راولپنڈی کینٹ

پروفیسر محمد اصغر چیمہ
وائس پرنسپل، گورنمنٹ ایسوسی ایٹ کالج، گکھڑ، ضلع وزیر آباد

محمد زبیر ساہی
سابق ڈائریکٹر، محکمہ خواندگی و غیر رسمی اور بنیادی تعلیم، لاہور

ڈاکٹر ماریہ امین
شعبۂ اُردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور

مرید حسین اوجلہ
گورنمنٹ ماڈل ہائی سکول، جام پور، ضلع راجن پور

ڈاکٹر غفور شاہ قاسم
پروفیسر (ر)، شعبۂ اُردو، گورنمنٹ ایف سی کالج یونیورسٹی، لاہور

محمد ظہیر کاشر ڈلو
ماہر مضمون (اُردو)، C&C یونٹ، PECTAA، لاہور

ڈاکٹر محمد سہیل سرور
ڈپٹی ڈائریکٹر (نصاب)، C&C یونٹ، PECTAA، لاہور

ڈاکٹر جمیل الرحمٰن
ڈپٹی ڈائریکٹر (ٹیکنیکل)، C&C یونٹ، PECTAA، لاہور

رابطہ کار: ڈاکٹر جمیل الرحمٰن — ڈپٹی ڈائریکٹر (ٹیکنیکل)، C&C یونٹ، PECTAA، لاہور

نگرانِ طباعت: ڈاکٹر جمیل الرحمٰن ◦ سرفراز احمد فتیانہ ◦ محمد ظہیر کاشر ڈلو

نظر ثانی: ڈاکٹر علی محمد خاں

ڈائریکٹر (کریکولم اینڈ کمپلائنس): عامر ریاض ◦ **انچارج آرٹ سیل:** عائشہ صادق ◦ **ڈپٹی ڈائریکٹر:** صفدر ولید

ڈیزائننگ: منال طارق ◦ حافظ انعام الحق ◦ **کمپوزنگ:** محمد جمیل کیرا ◦ محمد اظہر

تجرباتی ایڈیشن

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اللہ کے نام سے شروع جو بڑا مہربان ہمیشہ رحم فرمانے والا ہے۔

فہرست

حمد و نعت

نمبر شمار	عنوانات	شعرا	صفحہ نمبر
۱	حمد	حفیظ تائب	۰۲
۲	نعت	سید نفیس الحسینی نفیس	۰۶

حصہ نثر

نمبر شمار	عنوانات	مصنفین	صفحہ نمبر
۳	اخلاقِ نبوی ﷺ	شبلی نعمانیؒ	۱۲
۴	فاقہ میں روزہ	خواجہ حسن نظامی	۲۱
۵	مکاتیب غالب	اسد اللہ خاں غالب	۳۰
۶	ایک اُستاد عدالت کے کٹہرے میں	اشفاق احمد	۳۷
۷	چارپائی	رشید احمد صدیقی	۴۵
۸	اور پاکستان بن گیا	خدیجہ مستور	۵۱
۹	نیا قانون	سعادت حسن منٹو	۶۰
۱۰	دہلیز	امجد اسلام امجد	۷۱
۱۱	تاریخ کا کفن	امر جلیل	۸۱
۱۲	پاکستانی زبانیں اور اُن کا باہمی رشتہ	ڈاکٹر ممتاز منگلوری	۹۱

حصہ نظم

صفحہ نمبر	شعرا	عنوانات	نمبر شمار
۹۹	علامہ محمد اقبالؒ	اے وادیِ لولاب!	۱۳
۱۰۳	اختر شیرانی	او دیس سے آنے والے بتا	۱۴
۱۰۸	احسان دانش	آزادی	۱۵
۱۱۳	رحمان باباؒ (مترجم: پروفیسر محمد طہٰ خاں)	اخلاص	۱۶
۱۱۷	سیّد محمد جعفری	کھڑاؤنز	۱۷

حصہ غزل

صفحہ نمبر	شعرا	عنوانات	نمبر شمار
۱۲۲	میر تقی میرؔ	پتا پتا بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے	۱۸
۱۲۷	فراق گورکھپوری	سر میں سودا بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں	۱۹
۱۳۲	منیرؔ نیازی	بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا	۲۰
۱۳۷	احمد فرازؔ	سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے	۲۱
۱۴۱	پروین شاکر	بادباں کھلنے سے پہلے کا اشارہ دیکھنا	۲۲
۱۴۴	فرہنگ (بہ لحاظ الف بائی ترتیب)		

ضروری نوٹ:

1۔ ہر سبق کے آغاز میں، اس کے مصنف/ شاعر کا **مختصر تعارف** دیا گیا ہے، جس کا مقصد صرف پس منظری علم فراہم کرنا ہے۔ یہ تعارف: کسی بھی صورت اور کسی بھی انداز میں، سکول/ کالج اور بورڈ کے کسی ٹیسٹ یا امتحان کے کسی سوال کا حصہ قطعاً نہیں ہوگا۔

2۔ بعض اسباق کی مشقوں کے آخر میں نثر، نظم اور غزل کے چند ادب پارے، طلبہ کے ادبی ذوق کو مہمیز دینے کے لیے: **"برائے اضافی مطالعہ"** کے عنوان سے شامل کیے گئے ہیں۔ یاد رہے کہ ان میں سے کسی بھی صورت اور کسی بھی انداز میں کوئی بھی سوال، سکول/ کالج اور بورڈ کے کسی ٹیسٹ یا امتحان کا حصہ قطعاً نہیں ہوگا۔

حمد و نعت

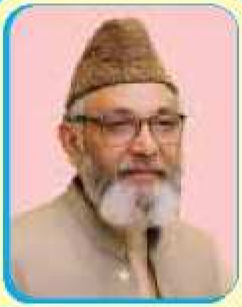

حفیظ تائبؔ

(۱۹۳۱ء۔ ۲۰۰۴ء)

حفیظ تائب کا اصل نام عبدالحفیظ منہاس ہے مگر وہ اپنے قلمی نام حفیظ تائبؔ سے اتنے معروف ہوئے کہ لوگ ان کا اصل نام بھول گئے۔ ان کا آبائی وطن تحصیل وزیر آباد کا ایک نواحی قصبہ احمد نگر ہے جہاں آپ کے والد حاجی چراغ دین منہاس ایک بڑے نیکوکار معلم اور امام وخطیب کے طور پر جانے جاتے تھے۔ حفیظ تائبؔ نے عربی، فارسی کی بنیادی تعلیم اپنے والد سے اور مڈل تک کی روایتی تعلیم اپنے قصبے کے مڈل سکول سے حاصل کی اور ۱۹۴۷ء میں میٹرک زمیندار ہائی سکول گجرات سے پاس کرنے کے بعد زمیندار کالج گجرات میں پری انجینئرنگ کلاس میں داخلہ لے لیا مگر ان کا طبعی میلان چوں کہ شعروشاعری کی طرف تھا اس لیے کالج کی تعلیم ترک کر دی اور ۱۹۴۷ء تا ۱۹۷۹ء محکمہ برقیات اور واپڈا میں ملازمت کی، اس دوران میں اُردو فاضل اور ایم۔اے پنجابی کے امتحانات پاس کر لیے۔ بعد ازاں جزوقتی استاد کی حیثیت سے پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ پنجابی کے ساتھ منسلک ہو گئے اور یہ سلسلہ ۲۰۰۳ء تک بخیر وخوبی جاری رہا۔

حفیظ تائبؔ پنجاب یونیورسٹی کے ساتھ منسلک ہونے سے پہلے بھی ایک مشہور حمد ونعت گو کی حیثیت سے پاکستان اور بیرونِ پاکستان جانے جاتے تھے اور ان کے مداحین ومحمودین قابلِ رشک تعداد میں موجود تھے۔ وہ اُردو اور پنجابی دونوں زبانوں میں حمد ونعت اور مناجات کہتے تھے۔

حکومتِ پاکستان نے ان کی خدمات کے اعتراف کے طور پر انھیں ۱۹۹۴ء میں تمغائے حسنِ کارکردگی عطا کیا۔ ان کی بے مثال کارکردگی کے پیشِ نظر لاہور کی ایک شاہراہ کا نام بھی ان سے منسوب کیا گیا ہے۔

حفیظ تائبؔ کے اب تک گیارہ شعری مجموعے چھپ چکے ہیں اور وہ ''کائناتِ حفیظ تائب'' کے نام سے کلیات کی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں مگر شاملِ نصاب 'حمد'' بھی ایک اعلیٰ پائے کا کلام ہے جس میں لفظوں کی تکرار اس طرح کی گئی ہے کہ یہ تکرار لفظی حمد کی شان بن گئی ہے۔

سبق: ۱

حمد

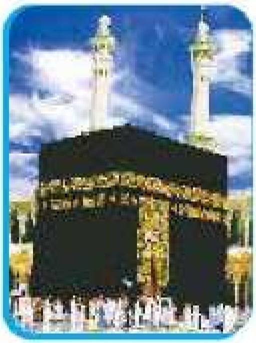

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو حمد کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو قرآن وسنت کی تعلیمات سے آگاہ اور ان کی اسلامی معلومات میں اضافہ کرنا۔
- طلبہ کی کردار سازی اور زندگی میں اخلاقی اصولوں، نیک اعمال کی اہمیت کو اجاگر کرنا۔
- طلبہ میں اسلامی اتحاد اور محبت کے احساسات میں اضافہ کرنا۔

کس کا نظام راہ نما ہے اَلحق اَلحق
کس کا دوام گونج رہا ہے اَلحق اَلحق
شانِ جلال کس کی عیاں ہے جُھلمل جُھلمل
رنگِ جمال کس کا جما ہے اَلحق اَلحق
کس کے لیے نُجوم بکف ہے روش روش
بابِ شہود کس کا کُھلا ہے اَلحق اَلحق
کس کے لیے عُرودِ صبا ہے چمن چمن
کس کے لیے نمودِ ضیا ہے اَلحق اَلحق
مکتوم کس کی موجِ کرم ہے صدَف صدَف
مرقوم کس کا حرفِ وفا ہے اَلحق اَلحق
کس کی طلب میں اہلِ محبت ہیں داغ داغ
کس کی ادا سے حشر بپا ہے اَلحق اَلحق
سوزاں ہے کس کی یاد میں تائبؔ نفس نفس
فُرقت میں کس کی، شعلہ نوا ہے اَلحق اَلحق

(کائنات، حفیظ تائبؔ)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) حفیظ تائب کی شاعری کے بنیادی موضوعات کیا ہیں؟

(ب) حفیظ تائب کی وجہِ شہرت شاعری کی کون کون سی اصناف ہیں؟

(ج) حرفِ وفا اُفق اُفق مرقوم کرنے کا مطلب کیا ہے؟

(د) شانِ جلال اور رنگِ جمال سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

(ہ) اس نظم کی ہیئت کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

۲۔ حوالوں کے ساتھ درج ذیل اشعار کی تشریح کریں:

کس کے لیے نجوم بکف ہے روش روش
بابِ شہود کس کا کھلا ہے اُفق اُفق
کس کے لیے سرودِ صبا ہے چمن چمن
کس کے لیے نمودِ ضیا ہے اُفق اُفق

۳۔ طلبہ باری باری بلند آواز میں ایک ایک شعر درست تلفظ اور لب و لہجہ کے ساتھ پڑھیں اور ان اشعار میں موجود اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نشانات پر تبصرہ کریں۔

۴۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) اُفق اُفق راہ نما ہے:

(الف) نظام (ب) دوام (ج) نام (د) جام

(ii) جبل جبل عیاں ہے:

(الف) جمال (ب) کمال (ج) جلال (د) استقلال

(iii) اُفق اُفق مرقوم ہے:

(الف) حرف و معنی (ب) لفظ لفظ (ج) وفا (د) حرفِ وفا

(iv) اللہ کی محبت میں داغ داغ ہیں:

(الف) اہلِ عقیدت (ب) اہلِ محبت (ج) اہلِ ثروت (د) اہلِ شریعت

(v) شعلہ نوائی کا سبب ہے:

(الف) محبت (ب) وصال (ج) فرقت (د) دیدار

۵۔ لغت کی مدد سے درج ذیل الفاظ کے معانی تلاش کریں اور اعراب لگا کر درست تلفظ واضح کریں:

نجوم شہود نفس مکتوم

فرقت مرقوم حشر

اصنافِ شعری (موضوع کے اعتبار سے):

حمد: جس نظم میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، ربوبیت، یکتائی اور دیگر صفات کا بیان ہو۔

نعت: جس نظم میں سرکارِ دو عالم خاتم النبیین ﷺ کی شان و شوکت، اوصاف و افعال اور کمالات کا بیان ہو۔

منقبت: جس نظم میں اہلِ بیت اطہار، صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنھم، اولیائے عظام، بزرگانِ دین یا کسی معروف شخصیت کے اوصاف بیان کیے جائیں۔

مناجات: جس نظم میں اللہ کے حضور اپنے گناہوں کا اعتراف کرتے ہوئے رقت انگیز انداز میں التجائیں اور دعائیں کی جائیں۔

۶۔ اصنافِ شعری کی درج بالا وضاحت کی روشنی میں اِن اصناف کی مثالیں تلاش کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- حمدیہ کلام ترنّم سے پڑھنے کے مقابلے میں حصّہ لیں۔
- حمدیہ اشعار پر مبنی چارٹ بنائیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو اُردو شاعری میں حمد نگاری کی تاریخ اور روایت سے آگاہ کریں۔
- حفیظ تائب کی شاعرانہ خصوصیات اور انفرادیت کے بارے میں بتائیں۔

سیّد نفیس الحسینی نفیس

(۱۹۳۳ء۔۲۰۰۸ء)

سیّد انور حسین؛ المعروف سیّد نفیس الحسینی نفیس، "سیّدالقلم" اور "نفیس رقم" کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ آپ نے اپنی زندگی میں سولہ مرتبہ قرآنِ پاک کی کتابت کی۔ آپ کی جائے ولادت تحصیل ڈسکہ میں موضع گھوڑیالہ ہے اور آپ کا سلسلۂ نسب پندرہ واسطوں سے حضرت خواجہ گیسو دراز" تک پہنچتا ہے۔ آپ نے اپنے نواحی گاؤں بھوپال والا سے ۱۹۴۶ء میں مڈل، سٹی مسلم ہائی سکول لائل پور (فیصل آباد) سے ۱۹۴۸ء میں میٹرک، گورنمنٹ کالج فیصل آباد سے ۱۹۵۰ء میں ایف۔ اے اور ۱۹۵۳ء میں اورینٹل کالج لاہور سے منشی فاضل کے امتحانات پاس کیے۔

سیّد انور حسین کا گھرانا فنِ خطاطی کا مرکز تھا اور آپ کو چھوٹی عمر ہی سے خطاطی کا شوق تھا۔ آپ کے والد صاحب جب خطاطی کرتے تو آپ ان کے دائیں جانب کھڑے ہو جاتے اور انھیں کتابت یا خطاطی کرتے دیکھتے۔ یہی وجہ ہے کہ سکول کے ابتدائی دور میں آپ کی لکھائی ہم جماعت طلبہ سے بہت اچھی تھی اور وہ آپ سے اپنی کاپیوں پر اپنا نام لکھواتے تھے۔ اس حوالے سے آپ کا آبائی پیشہ خطاطی تھا۔

اس ضمن میں آپ نے بذاتہٖ خطِ نسخ، خطِ نستعلیق، خطِ دیوانی، خطِ ثلث، خطِ رقاع اور خطِ کوفی میں متعدد فن پاروں کے علاوہ کلامِ اقبالؒ پر نستعلیق جلی میں بڑے دل کش انداز میں خطاطی کے فن پارے تخلیق کیے جو ایوانِ اقبالؒ میں آویزاں ہیں۔ آپ کو عجائب گھر لاہور اور خانہ کعبہ کے دروازے پر بھی خطاطی کرنے کا شرف حاصل ہے۔ اسی بنا پر حکومتِ پاکستان کی طرف سے آپ کے فن کے اعتراف میں ۱۹۸۶ء میں پرائیڈ آف پرفارمنس کا اعزاز حاصل ہوا۔

سید نفیس الحسینی نفیس کا میلانِ طبع اوائل عمری ہی سے شاعری کی طرف تھا۔ اس ضمن میں ان کے تین نعتیہ شعری مجموعے "گلہائے نقش"، "برگِ گل" اور "نفائس النبیؐ" جن کی کتابت بھی آپ نے خود کی تھی، بڑے اہتمام سے شائع ہوئے۔ ان تینوں مجموعوں کا تمام تر کلام عشق و عقیدت کے جذبات سے لبریز ہے۔ "برگِ گل" میں حمد و نعت، ساقیِ کوثر، تجھ سا کوئی نہیں، یا رسول اللہ صلی اللہ علیک، یادِ مدینہ، ارمغانِ مدینہ، انوارِ مدینہ، آرزوئے حسرت، صحنِ حرم، پیام آ ہی گیا اور میں تو اس قابل نہ تھا، جیسا کلام شامل ہے جو عشق و محبت کے وفورِ جذبات کا حامل ہے۔

سبق: ۲

نعت

تدریسی مقاصد:

- نعت کے لغوی و اصطلاحی معنی سے آگاہ کرتے ہوئے صنفِ نعت گوئی کی روایت اور ارتقا کا جائزہ لینا۔
- طلبہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت اور سنت کے بارے میں بتانا۔
- طلبہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرتِ طیبہ کی روشنی میں اپنے کردار کو ڈھالنے کی ترغیب دینا۔
- طلبہ کو سید نفیس الحسینیؒ کے نعتیہ اسلوب کی امتیازی خصوصیات سے روشناس کرانا۔

اے رسولِ امیںؐ، خاتم المرسلیںؐ، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
ہے عقیدہ یہ اپنا بہ صدق و یقیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

اے براہیمی و ہاشمی خوش لقب، اے تُوؐ عالی نسب، اے تُو والا حسب
دودمانِ قریش کے دُرِّ ثمیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

بزمِ کونین پہلے سجائی گئی، پھر تری ذات منظر پہ لائی گئی
سیّدالاوّلیں، سیّدالآخریں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

"سدرۃ المنتہیٰ" رہگزر میں تری، "قابَ قوسین" گردِ سفر میں تری
تُو ہے حق کے قریں، حق ہے تیرے قریں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

کہکشاں ضَو ترے سرمدی تاج کی، زُلفِ تاباں حسیں رات معراج کی
"لیلۃ القدر" تیری مُنوّر جبیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

مصطفیٰؐ مجتبیٰؐ، تیری مدح و ثنا، میرے بس میں نہیں، دسترس میں نہیں
دل کو ہمت نہیں، لب کو یارا نہیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

چار یاروں کی شانِ جلی ہے بھلی، ہیں یہ صدیقؓ، فاروقؓ، عثماںؓ، علیؓ
شاہدِ عدل ہیں یہ ترے جانشیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

اے سراپا نفیسؔ انفسِ دوجہاں، سرورِ دلبراں، دلبرِ عاشقاں
ڈھونڈتی ہے تجھے میری جانِ حزیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

(برگِ گل)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) رسولِ امیں ﷺ اور خاتم المرسلیں ﷺ کس عظیم ہستی کو کہا جاتا ہے؟
(ب) "سدرۃُ المنتہیٰ" اور "قابَ قوسین" سے کیا مراد ہے؟
(ج) آپ ﷺ کے نسب کے حوالے سے شاعر نے کیا کہا ہے؟
(د) شاعر نے رسولِ پاک ﷺ کے کس سفر کی طرف اشارہ کیا ہے؟
(ہ) شاعر نے رسولِ پاک ﷺ کی مدح و ثنا میں کون کون سے الفاظ بہ طور قافیہ استعمال کیے ہیں؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) یہ نعت ہیئت میں لکھی گئی ہے:

(الف) غزل کی (ب) مخمس کی (ج) مُسدّس کی (د) مثنوی کی

(ii) نعت کے اشعار میں صنعت نمایاں ہے:

(الف) صنعتِ تضمین (ب) صنعتِ مراعات النظیر (ج) صنعتِ تکرار (د) صنعتِ لف ونشر

(iii) "سکہ رواں ہونا" اُردو قواعد کی رُو سے ہے:

(الف) ضرب المثل (ب) روزمرہ (ج) محاورہ (د) کنایہ

(iv) "رسولِ امیں" اُردو قواعد کی رُو سے ہے:

(الف) مرکّبِ عطفی (ب) مرکّب اضافی (ج) مرکّب توصیفی (د) مرکّب عددی

(v) نعت کے چوتھے شعر میں صنعت استعمال ہوئی ہے:

(الف) صنعتِ تجنیس (ب) صنعتِ تضاد (ج) صنعتِ تلمیح (د) صنعتِ حُسنِ تعلیل

(vi) یہ نعت شاعر کے مجموعۂ شاعری سے لی گئی ہے:

(الف) "گلہائے نعت" سے (ب) "صلوا علیہ وآلہٖ" سے (ج) "برگِ گل" سے (د) "نفائس النبیؐ" سے

۳۔ اس نعت میں استعمال ہونے والی تراکیب کی نشان دہی کریں۔

۴۔ نعتیہ متن کے اہم نکات کو سمجھتے ہوئے نعت کا خلاصہ تحریر کریں۔

تلمیح: جب کلام میں کسی تاریخی، قرآنی، مذہبی یا کسی سماجی واقعہ کو چند لفظوں میں اشارۃً یوں بیان کیا جائے کہ سارا واقعہ تازہ ہو جائے تو اس کو تلمیح کہتے ہیں۔ مثلاً: درج ذیل اشعار میں ابنِ مریم اور چاہِ یوسف کی تلمیحات استعمال ہوئی ہیں:

ابنِ مریمؑ ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

(غالب)

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

(حالی)

۵۔ زیرِ مطالعہ نعت میں استعمال ہونے والی تلمیحات کی نشان دہی کرتے ہوئے ان کی وضاحت کریں۔

۶۔ شعری محاسن کی روشنی میں درج ذیل اشعار کی تشریح کریں:

مصطفیٰ مجتبیٰؐ، تیری مدح و ثنا، میرے بس میں نہیں، دسترس میں نہیں
دل کو ہمت نہیں، لب کو یارا نہیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں
اے سراپا نفیسؐ انفس دو جہاں، سرورِ دلبراں، دلبرِ عاشقاں
ڈھونڈتی ہے تجھے میری جانِ حزیں، تجھ سا کوئی نہیں، تجھ سا کوئی نہیں

۷۔ سمعی و بصری ذرائع سے کسی معروف شاعر کی کوئی نعت پڑھیں اور اس پر تبصرہ کریں۔

۸۔ درج ذیل نعت کے اشعار درست تلفظ اور لب و لہجہ کے ساتھ پڑھیں اور ان کے معانی پر غور کرتے ہوئے اپنی زندگی کے لیے رہ نمائی حاصل کریں:

تُوؐ مقصدِ تخلیق ہے تُوؐ حاصلِ ایماں
جو تجھ سے گریزاں وہ خدا سے ہے گریزاں
کردار کا یہ حال صداقت ہی صداقت
اخلاق کا یہ رنگ کہ قرآن ہی قرآں
اشکوں سے ترے دین کی کھیتی ہوئی سیراب
فاقوں نے ترے دہر کو بخشا سر و ساماں

(ماہرالقادری)

نظم بہ لحاظِ ہیئت: (غزل، مخمس، مسدس)

غزل: غزل کے تمام اشعار آپس میں ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ پہلا شعر مطلع ہوتا ہے جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ باقی تمام اشعار کا مصرعِ ثانی مطلعے سے ہم قافیہ ہوتا ہے۔ آخری شعر جس میں شاعر کا تخلص ہو، مقطع کہلاتا ہے۔ شاملِ نصاب نعت غزل کی ہیئت میں لکھی گئی ہے۔

مخمّس: ایسی نظم ہے جس کے ہر بند میں پانچ مصرعے ہوتے ہیں۔

مسدّس: ایسی نظم جس کے ہر بند میں چھے مصرعے ہوتے ہیں۔

علامہ اقبالؒ کے درج ذیل نعتیہ اشعار مسدّس کی ہیئت میں ہیں:

ہو نہ یہ پھول تو بُلبُل کا ترنّم بھی نہ ہو
چمنِ دہر میں کلیوں کا تبسّم بھی نہ ہو
یہ نہ ساقی ہو تو پھر مے بھی نہ ہو، خُم بھی نہ ہو
بزمِ توحید بھی دنیا میں نہ ہو، تم بھی نہ ہو
خیمہ افلاک کا اِستادہ اِسی نام سے ہے
نبضِ ہستی تپش آمادہ اِسی نام سے ہے

(جوابِ شکوہ: بانگِ درا)

۹۔ شاملِ نصاب نعت میں ایک شعر میں یارانِ نبیؐ کی توصیف بیان کی گئی ہے اس کی وضاحت کریں اور چاروں یارانِ نبیؐ کی خصوصی صفات بیان کریں۔

۱۰۔ درج ذیل الفاظ کا تلفظ اعراب کے ساتھ واضح کریں:

عقیدہ لقب حسب دودمان درثمین منظر قوسین کہکشاں

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- کالج میں اس نعت کو تحت اللفظ پڑھنے کے مقابلے میں حصّہ لیں۔
- علامہ اقبالؒ کے نعتیہ کلام کو ترنّم سے پڑھنے کے مقابلے کا کلاس میں اہتمام کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو اُردو میں نعت گوئی اور نعت خوانی کی روایت کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔
- طلبہ کو نعت میں مذکور صفات النبیؐ کے ذریعے سے اپنے کردار و عمل اور اخلاق کو سنوارنے کی تلقین کریں۔
- شاملِ نصاب نعت کی بلند خوانی کریں اور وضاحت طلب پہلوؤں کی وضاحت کریں۔

حصہ نثر

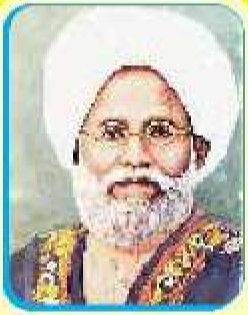

شبلی نعمانیؒ

(۱۸۵۷ء-۱۹۱۴ء)

اصل نام محمد شبلی تھا مگر شبلی نعمانی کے نام سے مشہور ہوئے۔ موضع بندول ضلع اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ حبیب اللہ وکالت کرتے تھے۔ ابتدائی تعلیم اپنے گاؤں میں پائی پھر اعظم گڑھ، غازی پور، سہارن پور اور لاہور میں تعلیم مکمل کی۔ وکالت کا امتحان بھی پاس کیا لیکن اس پیشے میں ان کا جی نہ لگا۔ علی گڑھ گئے جہاں سرسیّد احمد خاں نے انھیں عربی اور فارسی کا استاد مقرر کر دیا وہاں وہ سولہ برس تک پڑھاتے رہے۔ یہاں سے ان کی زندگی کا نیا دور شروع ہوا۔ علی گڑھ میں پروفیسر تھامس آرنلڈ سے فرانسیسی سیکھی اور انھیں عربی سکھائی۔ سرسیّد احمد خاں کی وفات کے بعد علی گڑھ سے حیدر آباد دکن چلے گئے جہاں وہ چار سال تک ناظمِ تعلیمات کے عہدے پر فائز رہے۔ وہاں سے پھر واپس لکھنؤ آ گئے اور دارالعلوم "ندوہ" سے وابستہ ہوئے۔ آخری دور میں اختلافات کے سبب ندوہ سے بھی الگ ہو گئے اور اعظم گڑھ میں "دارالمصنفین" کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا جہاں سے اعلیٰ درجے کی کئی ایک کتابیں شائع کیں۔

شبلی نعمانی ایک جامع الصفات شخصیت تھے۔ مفکر، مورخ، ناقد، فقیہ، مصلح، واعظ کے علاوہ شاعر اور صاحبِ ذوق شخصیت تھے۔ اُردو ادب میں ان کی کتابوں کا رتبہ بہت بلند ہے۔ ان کی اہم کتابوں میں "المامون"، "سیرۃ النعمان"، "الفاروق"، "الغزالی"، "موازنۂ انیس و دبیر" اور "شعر العجم" نمایاں ہیں۔ زندگی کے آخری دور میں ان کی تمام تر توجہ "سیرت النبیؐ" پر مرکوز رہی جو کہ اُردو سیرت نگاری میں ان کا اہم کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ کتاب انھوں نے اپنی عمر کے آخری حصے میں لکھنا شروع کی تھی مگر وہ اس کی دو جلدیں ہی مکمل کر پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور باقی ماندہ جلدیں انھیں کے فراہم کردہ مواد سے ان کے شاگردِ خاص سیّد سلیمان ندوی نے مکمل کیں۔ زیرِ نظر اقتباس اسی کتاب سے لیا گیا ہے۔

شبلی کا اندازِ تحریر شگفتہ، رواں اور مدلل ہے۔ ان کی تحریروں میں شوخی و حسن بھی ہے اور فکر کی گہرائی بھی۔ ان کے ہاں فارسی و عربی کے الفاظ اور تراکیب کثرت سے استعمال ہوتے ہیں جو سادہ و عام فہم اور عبارت کے حسن میں اضافہ کرتے ہیں۔

سبق: ۳

اخلاقِ نبوی ﷺ

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو مولانا شبلی نعمانی کی سیرت نگاری، اسلامی تاریخ اور ثقافت کے اہم پہلوؤں سے رُوشناس کرانا۔
- طلبہ کو تاریخی تحقیق کے اصول اور طریقہ ہائے کار کے بارے میں آگاہ کرنا۔
- طلبہ کی اخلاقی تربیت کرنا اور ان کے مذہبی، دینی شعور میں اضافہ کرنا۔

مداومتِ عمل:

اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے کہ انسان جس کام کو اختیار کرے اس پر اس قدر استقلال کے ساتھ قائم رہے کہ گویا وہ اس کی فطرتِ ثانیہ بن جائے۔ انسان کے سوا تمام دنیا کی مخلوق صرف ایک ہی قسم کا کام کر سکتی ہے اور وہ فطرتاً اس پر مجبور ہے۔ اخلاق کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے اخلاقِ حسنہ کا جو پہلو پسند کرے اس کی اس شدت سے پابندی کرے اور اس طرح دائمی اور غیر منقطع طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر مجبور ہے اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات سرزد ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اس سے یہ افعال اس طرح صادر ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے روشنی، درخت سے پھل، پھول سے خوشبو، کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں۔ اس کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔

حضرت محمد رسول اللہ ﷺ اپنے تمام کاموں میں اسی اُصول کی پابندی فرماتے تھے، جس کام کو جس طریقہ سے جس وقت آپ ﷺ نے شروع فرمایا اس پر برابر شدت کے ساتھ قائم رہے۔ سُنّت کا لفظ ہماری شریعت میں اسی اصول سے پیدا ہوا ہے۔ سنت وہ فعل ہے، جس پر حضرت محمد رسول اللہ ﷺ نے ہمیشہ مداومت فرمائی ہے اور بغیر کسی قوی مانع کے کبھی اس کو ترک نہیں فرمایا۔ اس بنا پر جس قدر سنن ہیں وہ درحقیقت آپ ﷺ کی استقامتِ حال اور مداومتِ عمل کی ناقابلِ انکار مثالیں ہیں۔

حسنِ خُلق:

معمول یہ تھا کہ کسی سے ملنے کے وقت ہمیشہ پہلے خود سلام اور مصافحہ فرماتے، کوئی شخص جھک کر آپ ﷺ کے کان میں کچھ بات کہتا تو اس وقت تک اس کی طرف سے رُخ نہ پھیرتے، جب تک وہ خود مُنھ نہ ہٹائے۔ مصافحہ میں بھی یہی معمول تھا، یعنی کسی سے ہاتھ ملاتے تو جب تک وہ خود نہ چھوڑ دے، اس کا ہاتھ نہ چھوڑتے۔ مجلس میں بیٹھتے تو آپ ﷺ کے زانو کبھی ہم نشینوں سے آگے نکلے ہوئے نہ ہوتے۔ اکثر نوکر چاکر، غلام، خدمتِ اقدس میں پانی لے کر آتے کہ آپ ﷺ اس میں ہاتھ ڈال دیں تاکہ متبرک ہو جائے۔ جاڑوں کے دن اور صبح کا وقت ہوتا، تاہم آپ ﷺ کبھی انکار نہ فرماتے۔

مجالسِ صحبت میں لوگوں کی ناگوار باتوں کو برداشت فرماتے اور اس کا اظہار نہ کرتے۔ کسی شخص کی کوئی بات ناپسند آتی تو اکثر اس کے

سامنے اس کا تذکرہ نہ فرماتے۔ ایک دفعہ ایک صاحب عرب کے دستور کے مطابق زعفران لگا کر خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے کچھ نہ فرمایا۔ جب وہ اٹھ کر چلے گئے تو لوگوں سے کہا کہ ان سے کہہ دینا کہ یہ رنگ دھو ڈالیں۔

مسجدِ نبویؐ میں جگہ بہت کم ہوتی تھی، جو لوگ پہلے سے آکر بیٹھ جاتے تھے، ان کے بعد جگہ باقی نہیں رہتی تھی۔ ایسے موقع پر اگر کوئی آجاتا تو اس کے لیے آپ ﷺ خود اپنی ردائے مبارک بچھا دیتے تھے۔ کسی کی بات بری معلوم ہوتی تو مجلس میں نام لے کر اس کا ذکر نہیں کرتے تھے بلکہ صیغۂ تعمیم کے ساتھ فرماتے تھے کہ لوگ ایسا کرتے ہیں، لوگ ایسا کہتے ہیں، بعض لوگوں کی یہ عادت ہے۔ یہ طریقۂ ابہام اس لیے فرماتے تھے کہ شخصِ مخصوص کی ذلت نہ ہو اور اس کے احساسِ غیرت میں کمی نہ آئے۔

ایثار:

آپ ﷺ کے اخلاق و عادات میں جو وصف سب سے زیادہ نمایاں اور جس کا اثر ہر موقع پر نظر آتا تھا، وہ ایثار تھا۔ اولاد سے آپ ﷺ کو بے انتہا محبت تھی اور ان میں حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنھا اس قدر عزیز تھیں کہ جب آتیں، فرطِ محبت سے کھڑے ہو جاتے، پیشانی کو بوسہ دیتے اور اپنی جگہ پر بٹھاتے تاہم حضرت سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ تعالیٰ عنھا کی عسرت اور تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں اور خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں۔ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں۔ ایک دن خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئیں، خود تو پاسِ حیا سے عرضِ حال نہ کر سکیں، جنابِ امیر (حضرت علی کرم اللہ وجہہ) نے ان کی طرف سے یہ حال عرض کیا اور درخواست کی کہ فلاں غزوہ میں جو کنیزیں آئی ہیں ان میں سے ایک کنیز مل جائے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا، ابھی اصحابِ صُفّہ کا انتظام نہیں ہوا اور جب تک ان کا بندوبست نہ ہولے میں اور طرف توجہ نہیں کر سکتا۔

تواضع:

گھر کا کام کاج خود کرتے، کپڑوں میں پیوند لگاتے، گھر میں خود جھاڑو دیتے، دودھ دوہ لیتے، بازار سے سودا لاتے، جوتی پھٹ جاتی تو خود گانٹھ لیتے، گدھے کی سواری سے آپ ﷺ کو عار نہ تھی، غلاموں اور مسکینوں کے ساتھ بیٹھنے اور ان کے ساتھ کھانا کھانے سے پرہیز نہ تھا۔ ایک دفعہ گھر سے باہر تشریف لائے؛ لوگ تعظیم کو اُٹھ کھڑے ہوئے، فرمایا کہ اہلِ عجم کی طرح تعظیم کے لیے نہ اُٹھو۔ غریب سے غریب بیمار ہوتا تو عیادت کو تشریف لے جاتے۔ مفلسوں اور فقیروں کے ہاں جا کر ان کے ساتھ بیٹھتے۔ صحابہؓ کے ساتھ بیٹھتے تو اس طرح بیٹھتے کہ امتیازی حیثیت کی بنا پر کوئی آپ ﷺ کو پہچان نہ سکتا۔ کسی مجمع میں جاتے تو جہاں جگہ مل جاتی بیٹھ جاتے۔ ایک دفعہ ایک شخص ملنے آیا لیکن نبوّت کا اس قدر رعب طاری ہوا کہ کانپنے لگا۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ گھبراؤ نہیں، میں فرشتہ نہیں ایک قریشی عورت کا بیٹا ہوں، جو سوکھا گوشت پکا کر کھایا کرتی تھی۔

بچوں پر شفقت:

بچوں پر نہایت شفقت فرماتے تھے۔ معمول تھا کہ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں جو بچے ملتے ان میں سے کسی کو اپنے ساتھ سواری

پر آگے پیچھے بٹھاتے۔ راستے میں بچّے ملتے تو ان کو خود سلام کرتے۔

ایک دن حضرت خالد بن سعید رضی اللہ تعالیٰ عنہ خدمتِ اقدس میں آئے۔ ان کی چھوٹی لڑکی بھی ساتھ تھی اور سرخ رنگ کا کُرتا بدن پر تھا۔ آپ ﷺ نے فرمایا، سَنہ سَنہ۔ حبشی زبان میں حسنہ کو سَنہ کہتے ہیں۔ چوں کہ ان کی پیدائش حبش میں ہوئی تھی اس لیے آپ ﷺ نے اس مناسبت سے حبشی تلفّظ میں حسنہ کے بجائے سَنہ کہا۔

یہ محبت اور شفقت مسلمان بچّوں تک محدود نہ تھی بلکہ مشرکین کے بچّوں پر بھی اسی طرح لطف فرماتے تھے۔ ایک دفعہ ایک غزوہ میں چند بچّے جھپٹ میں آ کر مارے گئے۔ آپ ﷺ کو خبر ہوئی تو نہایت آزردہ ہوئے۔ ایک صاحب نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! وہ مشرکین کے بچّے تھے۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''مشرکین کے بچّے بھی تم سے بہتر ہیں، خبردار! بچّوں کو قتل نہ کرو، ہر جان خدا ہی کی فطرت پر پیدا ہوتی ہے۔''

معمول تھا کہ جب فصل کا نیا میوہ کوئی خدمتِ اقدس میں پیش کرتا تو حاضرین میں جو سب سے زیادہ کم عمر بچّہ ہوتا اس کو عنایت فرماتے۔ بچّوں کو چومتے اور ان کو پیار کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپ ﷺ اسی طرح بچّوں کو پیار کر رہے تھے کہ ایک بدوی آیا، اس نے کہا: ''آپ لوگ بچّوں کو پیار کرتے ہیں، میرے دس بچّے ہیں مگر اب تک میں نے کسی کو پیار نہیں کیا۔'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ اگر تمھارے دل سے محبت کو چھین لے تو میں کیا کروں؟''

لطفِ طبع:

کبھی کبھی ظرافت کی باتیں فرماتے۔ ایک دفعہ حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پکارا تو فرمایا ''او دو کان والے۔'' اس میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت اطاعت شِعار تھے اور ہر وقت آپ ﷺ کے ارشاد پر کان لگائے رکھتے تھے۔ حضرت اَنس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے چھوٹے بھائی کا نام ابو عمیر تھا، وہ کم سِن تھے اور ایک ممولا پال رکھا تھا کہ اتفاق سے وہ مر گیا۔ ابو عمیر کو بہت رنج ہوا۔ آپ ﷺ نے ان کو غم زدہ دیکھا تو فرمایا: ''ابو عمیر! تمھارے ممولے نے یہ کیا کیا؟''

ایک شخص نے عرض کی کہ مجھ کو کوئی سواری عنایت ہو۔ ارشاد ہوا کہ میں تم کو اونٹنی کا بچہ دوں گا۔ انھوں نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! میں اونٹنی کا بچہ لے کر کیا کروں گا؟'' آپ ﷺ نے فرمایا کہ کوئی اونٹ ایسا بھی ہوتا ہے جو اونٹنی کا بچہ نہ ہو؟

ایک بڑھیا خدمتِ اقدس میں آئی کہ حضور ﷺ میرے لیے دعا فرمائیں کہ مجھے بہشت نصیب ہو۔ آپ ﷺ نے فرمایا کہ بوڑھی عورتیں بہشت میں نہیں جائیں گی۔ اس کو بہت صدمہ ہوا اور روتی ہوئی واپس چلی گئی۔ آپ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا کہ اسے کہہ دو کہ بوڑھی عورتیں جنّت میں جائیں گی لیکن جوان ہو کر جائیں گی۔

ایک بدوی صحابی تھے جن کا نام زاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھا۔ وہ دیہات کی چیزیں آپ ﷺ کی خدمت میں ہدیہ بھیجا کرتے تھے۔ ایک دفعہ وہ شہر میں آئے۔ گاؤں سے جو چیزیں لائے تھے ان کو بازار میں فروخت کر رہے تھے۔ اتفاقاً آپ ﷺ ادھر سے گزرے۔ حضرت زاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پیچھے جا کر ان کو گود میں دبا لیا۔ انھوں نے کہا: ''کون ہے؟ چھوڑ دو۔'' مڑ کر دیکھا تو

سرورِ عالم ﷺ تھے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ”کوئی اس غلام کو خریدتا ہے؟“ بولے: ”یارسول اللہ ﷺ! مجھ جیسے غلام کو جو شخص خریدے گا نقصان اٹھائے گا۔“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”لیکن خدا کے نزدیک تمھارے دام زیادہ ہیں۔“

ایک شخص نے آکر شکایت کی کہ میرے بھائی کے شکم میں گرانی ہے۔ فرمایا: ”شہد پلاؤ۔“ وہ دوبارہ آئے کہ شہد پلایا لیکن شکایت اب بھی باقی ہے۔ آپ ﷺ نے پھر شہد پلانے کی ہدایت کی۔ سہ بارہ آئے، پھر وہی جواب ملا۔ چوتھی بار آئے تو فرمایا: ”خدا سچا ہے، شہد میں شفا ہے لیکن تمھارے بھائی کا پیٹ جھوٹا ہے، جاکر شہد پلاؤ۔“ اب کی بار پلایا تو شفا ہوگئی۔ معدہ میں مادۂ فاسد کثرت سے موجود تھا جب پورا تنقیہ ہوگیا تو گرانی جاتی رہی۔

اولاد سے محبت:

اولاد سے نہایت محبت تھی۔ معمول تھا کہ جب کبھی سفر فرماتے تو سب سے آخر میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے پاس جاتے اور سفر سے واپس آتے تو جو شخص سب سے پہلے باریابِ خدمت ہوتا وہ بھی حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا ہی ہوتیں۔ ایک دفعہ کسی غزوہ میں گئے۔ اسی اثنا میں حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے دونوں صاحبزادوں (حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہم) کے لیے چاندی کے کنگن بنوائے اور دروازے پر پردے لٹکائے۔ آنحضرت ﷺ واپس تشریف لائے تو خلافِ معمول حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر نہیں گئے۔ وہ سمجھ گئیں، فوراً پردوں کو چاک کر ڈالا اور صاحبزادوں کے ہاتھ سے کنگن اُتار لیے۔ صاحبزادے روتے ہوئے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیے کہ ان کے بدلے ہاتھی دانت کے کنگن لا دو۔

حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا جب آپ ﷺ کی خدمت میں تشریف لاتیں تو آپ ﷺ کھڑے ہو جاتے، ان کی پیشانی کو چومتے اور اپنی نشست گاہ سے ہٹ کر اپنی جگہ بٹھاتے۔ حسنین کریمین رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے بے انتہا محبت تھی، فرماتے تھے کہ یہ میرے گل دستے ہیں۔ حضرت فاطمہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے گھر تشریف لے جاتے تو فرماتے کہ میرے بچوں کو لانا۔ وہ صاحبزادوں کو لاتیں، آپ ﷺ ان کو چومتے اور سینے سے لپٹاتے۔ ایک دفعہ مسجد میں خطبہ فرما رہے تھے۔ اتفاق سے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرخ کپڑے پہنے ہوئے آئے، کم سنی کی وجہ سے ہر قدم پر لڑکھڑاتے جاتے تھے۔ آپ ﷺ ضبط نہ کر سکے۔ منبر سے اتر کر گود میں اٹھالیا اور اپنے سامنے بٹھالیا۔ پھر فرمایا: ”خدا نے سچ کہا ہے: اِنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ“ فرمایا کرتے تھے: حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ میرا ہے اور میں اس کا ہوں۔ خدا اس سے محبت رکھے جو حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت رکھتا ہے۔ ایک دفعہ امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ یا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ دوشِ مبارک پر سوار تھے۔ کسی نے کہا: ”کیا سواری ہاتھ آئی ہے!“ آپ ﷺ نے فرمایا: ”سوار بھی کیسا ہے؟“

ایک دفعہ آپ ﷺ کہیں دعوت میں جا رہے تھے، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ راہ میں کھیل رہے تھے۔ آپ ﷺ نے آگے بڑھ کر ہاتھ پھیلائے۔ وہ ہنستے ہوئے پاس آ آ کر نکل جاتے تھے۔ بالآخر آپ ﷺ نے اُن کو پکڑ لیا۔ ایک ہاتھ ان کی ٹھوڑی پر اور ایک سر پر رکھ کر سینے سے لپٹا لیا پھر فرمایا: ”حسین میرا ہے، میں اس کا ہوں۔“ اکثر امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو گود میں لیتے اور فرماتے کہ خدایا! میں اس کو چاہتا ہوں اور اس کو بھی چاہتا ہوں جو اس کو چاہے۔

آپ ﷺ کے داماد، حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے شوہر جب بدر سے قید ہو کر آئے تو فدیہ کی رقم ادا نہ کر سکے تو گھر کہلا بھیجا۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے گلے کا ہار بھیج دیا۔ یہ وہ ہار تھا کہ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کے جہیز میں حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے ان کو دیا تھا۔ آنحضرت ﷺ نے ہار دیکھا تو بے تاب ہو گئے اور آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ پھر صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمایا کہ اگر تمھاری مرضی ہو تو ہارِ زینب ؓ کو بھیج دوں۔ سب نے بسر و چشم منظور کیا۔

آپ ﷺ کی ایک نواسی حالتِ نزع میں تھیں، صاحبزادی نے بُلا بھیجا۔ آپ ﷺ تشریف لے گئے تو لڑکی اسی حالت میں آغوشِ مبارک میں رکھ دی گئی۔ آپ ﷺ نے اس کی حالت دیکھی تو آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ حضرت سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کہا: ''یا رسول اللہ ﷺ! آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟'' آپ ﷺ نے فرمایا: ''یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔'' حضرت ابراہیم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی وفات پر بھی آپ ﷺ نے آب دیدہ ہو کر فرمایا تھا: ''آنکھیں آنسو بہا رہی ہیں، دل غم زدہ ہو رہا ہے، لیکن منھ سے ہم وہی باتیں کہیں گے جس کو خدا پسند کرتا ہے۔''

(سیرت النبیؐ جلد دوم)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) مداومتِ عمل سے کیا مراد ہے؟

(ب) شریعتِ اسلام میں سنّت کا لفظ کس اُصول سے پیدا ہوا ہے؟

(ج) آپ ﷺ کے اخلاق و عادات میں سب سے نمایاں وصف کون سا تھا؟

(د) ''عُسرت اور تنگ دستی کا یہ حال تھا کہ گھر میں کوئی خادمہ نہ تھی، خود چکی پیستیں، خود ہی پانی کی مشک بھر لاتیں۔ چکی پیستے پیستے ہتھیلیاں گھس گئی تھیں۔'' یہ احوال کس ہستی کے ہیں اور انھیں رسول اللہ ﷺ کے سامنے کس نے پیش کیا؟

(ہ) ''یہ رحم ہے جس کو خدا نے اپنے بندوں کے دلوں میں ڈال دیا ہے۔'' رسول اللہ ﷺ نے یہ الفاظ کس موقع پر ارشاد فرمائے؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) سبق ''اخلاقِ نبوی'' ''سیرت النبیؐ'' کی جلد سے ماخوذ ہے:

(الف) جلد اوّل سے (ب) جلد دوم سے (ج) جلد سوم سے (د) جلد چہارم سے

(ii) اگر انسان کوئی کام اختیار کرے اور اس پر استقلال کے ساتھ قائم رہے، اسے کہتے ہیں:

(الف) عادت (ب) جبلّت (ج) فطرت (د) فطرتِ ثانیہ

(iii) معمول کے مطابق آپ ﷺ سفر سے تشریف لاتے تو راہ میں اپنے ساتھ سواری پر آگے پیچھے بٹھاتے:

(الف) بچوں کو (ب) نوجوانوں کو (ج) جوانوں کو (د) بزرگوں کو

(iv) "لیکن خدا کے نزدیک تمھارے دام زیادہ ہیں۔" آپ ﷺ نے یہ الفاظ ارشاد فرمائے:

(الف) جنابِ امیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے (ب) حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے

(ج) حضرت زاہر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے (د) حضرت بلال رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے

(v) آپ ﷺ نے کنگن لے کر بازار میں بھیج دیے کہ ان کے بدلے کنگن لا دو:

(الف) کانسی کے (ب) سونے کے (ج) چاندی کے (د) ہاتھی دانت کے

۳۔ سبق کے متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے دُرست الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کر کے اقتباس مکمل کریں:

اخلاق کا ایک دقیق ۔۔۔۔ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے ۔۔۔۔ حسنہ کا جو پہلو پسند کرے اس کی اس شدت سے ۔۔۔۔ کرے اور اس طرح دائمی اور غیر ۔۔۔۔ طریقے سے اس پر عمل کرے کہ گویا وہ اپنے اختیار کے باوجود اس کام کے کرنے پر ۔۔۔۔ ہے اور لوگ دیکھتے دیکھتے یہ یقین کر لیں کہ اس شخص سے اس کے علاوہ اور کوئی بات ۔۔۔۔ ہو ہی نہیں سکتی۔ گویا اس سے یہ افعال اس طرح ۔۔۔۔ ہوتے ہیں جیسے آفتاب سے ۔۔۔۔، درخت سے ۔۔۔۔، پھول سے ۔۔۔۔ کہ یہ خصوصیات ان سے کسی حالت میں الگ نہیں ہو سکتیں۔ اس کا نام استقامت ۔۔۔۔ اور مداومت ۔۔۔۔ ہے۔

۴۔ "اخلاقِ نبوی" کے کسی ایک پہلو پر گفتگو کریں۔

۵۔ سبق "اخلاقِ نبوی" کو مدِ نظر رکھتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کی بچوں اور اولاد سے محبت کے بارے میں آپس میں بات چیت کریں۔

۶۔ نیچے دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں اور عبارت کا مناسب عنوان لکھیں:

کسی منفی رجحان کے نتیجے میں اپنے سخت ردِ عمل پر قابو پا لینا، برداشت ہے اور ردِ عمل کے طور پر منفی رویّے کے بجائے مثبت حسنِ سلوک کو روا رکھنا، رواداری کہلاتا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس وقت جن منفی رجحانات سے دوچار ہے، ان میں عدم برداشت، سرِ فہرست ہے۔ جس کے باعث ہمارے اندر رواداری کا وصف ختم ہوتا جا رہا ہے۔ ہمیں روزانہ ایسے بہت سے لوگوں سے واسطہ پڑتا ہے جو چھوٹی چھوٹی اور انتہائی معمولی باتوں پر ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں ہو رہے ہوتے ہیں۔ اگر ہم لوگ تھوڑی دیر کے لیے صبر و تحمل، برداشت اور حوصلے سے کام لیں تو بہت بڑے مالی و جانی نقصان سے بچ سکتے ہیں۔ برداشت کا وصف لوگوں میں اُس وقت پیدا ہوگا جب وہ رواداری اور حسنِ سلوک کو اپنا شعار بنائیں گے۔ ہمارے پیارے نبی حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے مشعلِ راہ ہے۔

آپ ﷺ نے ہمیشہ برداشت اور رواداری سے کام لیتے ہوئے ہمارے لیے ایسی بے شمار زندہ مثالیں قائم کیں جو رہتی دنیا تک انسانیت کے لیے رُشد و ہدایت کا ذریعہ بنی رہیں گی۔ کفارِ مکہ کی طرف سے آپ ﷺ کے راستے میں کانٹے بچھائے گئے، آپ ﷺ پر پتھر برسائے گئے، طرح طرح کی اذیتوں سے دوچار کیا گیا مگر آپ ﷺ نے ہمیشہ برداشت اور تحمل سے کام لیا بلکہ فتح مکہ کے موقع پر تمام دشمنانِ اسلام کو معاف فرما دیا۔ رسول اللہ ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے ہمیں بھی اپنی معاشرتی روایات کو حوصلہ مندی اور صبر و برداشت کے اصولوں پر قائم رکھنے کا عزم کرنا چاہیے، تاکہ ہم آپس میں باہمی اِخلاص اور مثالی بھائی چارے کو فروغ دے سکیں۔

سوالات:

- منفی رجحان سے کیا مراد ہے؟
- رواداری کسے کہتے ہیں؟
- کفارِ مکہ آپ ﷺ سے کیسا سلوک کرتے تھے؟
- سیرتِ طیبہ کی روشنی میں ہمیں کیسا طرزِ عمل اختیار کرنا چاہیے؟
- فتح مکہ کے موقع پر آپ نے دشمنانِ اسلام کے ساتھ کیا سلوک کیا؟
- اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

فعل کی اقسام (بلحاظ معنی)

فعل لازم: جب کسی جملے میں استعمال ہونے والے فعل کے ساتھ صرف فاعل آئے اور جملے کا مفہوم سمجھ میں آجائے تو وہ فعل، فعل لازم کہلاتا ہے۔ مثلاً:

اکبر آیا۔ عمران جاگا۔ سلیمان بیٹھا۔

فعل متعدی: جب کسی جملے میں فاعل کے ساتھ ساتھ مفعول لگا کر مفہوم واضح کیا جائے تو استعمال ہونے والا فعل، فعل متعدی کہلائے گا۔ مثلاً:

اسلم کتاب پڑھ رہا ہے۔ بلّی نے چوہے کو پکڑ لیا۔

ے۔ فعل کی پہچان کر کے ان کے سامنے فعل لازم یا فعل متعدی لکھیں:

وہ مدرسے گیا۔		میں نے کتاب پڑھی۔	
ہم نے کھانا کھایا۔		تم نے پانی پیا۔	
وہ دیر سے جاگا۔		نادیہ ابھی آئی ہے۔	
امجد نے خط لکھا۔		قصاب نے بکرا خریدا۔	

سیاق و سباق (Context):

کسی بھی بیان، واقعہ، عمل یا تحریر کے وہ متعلقہ حالات و واقعات، ماحول یا پس منظر کو کہتے ہیں جو اُس کے درست مفہوم کو سمجھنے میں مدد دیں۔ سیاق و سباق کے بغیر کسی بات کا درست مفہوم سمجھنا دشوار ہو سکتا ہے۔

نوٹ: اساتذہ اپنے طلبہ کو معیاری اور مثالی سیاق وسباق لکھنے کی مشق کروائیں۔

حوالۂ متن (Reference): حوالۂ متن سے مراد ہے کسی دیے ہوئے اقتباس، عبارت یا تحریری مواد کے حوالہ جات بیان کرنا۔ عام طور پر سبق کا عنوان، مصنف کا نام اور ماخذ درج کرنا حوالۂ متن کہلاتا ہے۔ **مثلاً:**

سبق کا عنوان: اخلاقِ نبویؐ

مصنف کا نام: شبلی نعمانی

ماخذ: سیرت النبیؐ (جلد دوم)

۸۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کریں:

(الف) ''اخلاق کا سب سے مقدم اور ضروری پہلو یہ ہے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔اس کا نام استقامتِ حال اور مداومتِ عمل ہے۔''

(ب) ''اولاد سے نہایت محبت تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ہاتھی دانت کے کنگن لا دو۔''

۹۔ ''ہماری زندگی میں حُسنِ خلق کی اہمیت'' کے موضوع پر ایک پیراگراف تحریر کریں۔

سرگرمی برائے طلبہ:

- محلے یا سکول کی لائبریری سے سیرتِ مبارکہ سے متعلق کوئی کتاب حاصل کریں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت سے رواداری اور برداشت سے متعلق واقعات پڑھ کر ساتھیوں کو سنائیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو تقریر کرنے کے انداز اور لب ولہجے سے آگاہ کریں۔
- تفہیم عبارت کے ضمن میں طلبہ کو مطلوبہ عبارت کا مفہوم سمجھائیں اور انھیں تاکید کریں کہ جتنا سوال ہو، اسی قدر جواب دیں۔
- سیاق وسباق کے حوالے سے پیراگراف کی تشریح کرنے کا انداز تختۂ تحریر کی مدد سے سمجھائیں۔

خواجہ حسن نظامی

(۱۸۷۹ء-۱۹۵۵ء)

اصل نام "سیدعلی حسن" تھا۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی ہمشیرہ کی اولاد میں سے تھے اور ساری زندگی خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ علیہ کی درگاہ کے زیرِ سایہ گزاری۔ درگاہ کے متولی تھے۔ انھوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی۔ کتب بینی کا شوق تھا، اپنی ہمت اور شوق سے پڑھا۔ شروع میں کتابیں بیچتے تھے پھر کتابیں لکھیں، رسالوں کے "مدیر" ہوئے اور ساری زندگی تصنیف و تالیف میں گزاری۔ انھوں نے بے شمار مضامین، پمفلٹ اور کتابیں لکھیں۔ موضوعات کا تنوع ان کا خاصہ تھا۔ روحانیات اور مذہبیات سے لے کر عملی زندگی اور تراکیب و نسخوں سمیت انھوں نے ہر موضوع پر لکھا لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی اور مغلیہ خاندان کی بربادی ان کے خاص موضوعات تھے۔ ان کی اہم کتابوں میں: "بیگمات کے آنسو"، "سی پارۂ دل"، "غدرِ دہلی کے افسانے" اور "مضامینِ حسن نظامی" زیادہ مشہور ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کا شمار اُردو کے منفرد اور صاحبِ طرز انشا پردازوں میں ہوتا ہے۔ ان کی تحریروں میں سادگی، روانی اور تاثیر کی خصوصیات نمایاں ہیں۔ وہ اپنے دور کی دہلی کی رواں، شستہ اور صاف زبان استعمال کرتے ہیں جس میں وہ بے تکلفی لیکن چستی اور موزونیت سے کام لے کر سوز و گداز کا عنصر پیدا کر دیتے ہیں۔

خواجہ حسن نظامی کو مضمون نویسی اور انشائیہ نگاری میں خاص ملکہ اور مقام حاصل تھا۔ انھوں نے نہایت ہی منفرد، انوکھے اور دل چسپ موضوعات پر طبع آزمائی کی۔ خواجہ حسن نظامی معمولی چیز کو موضوع بنا لیتے ہیں اور اپنے اسلوبِ تحریر اور منفرد، متنوع پہلوؤں سے اس میں نئی دلچسپیاں اور انوکھے زاویے پیدا کر دیتے ہیں۔ وہ بات سے بات پیدا کرتے چلے جاتے ہیں۔ ان کا انداز ایک کھلے ذہن، کھلے دل اور وسیع المشرب نقطۂ نظر رکھنے والے صوفی کا ہے۔

سبق: ۴

فاقہ میں روزہ
(تاج دارِ دہلی کے ایک کنبے کا فسانہ)

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کے ادبی ذوق کی تربیت کرنا۔
- طلبہ کے سماجی، سیاسی اور اخلاقی شعور میں اضافہ کرنا۔
- ''فاقہ میں روزہ'' جیسے مضامین سماجی مسائل اور غربت کی حالت کو بیان کرتے ہیں، خواجہ حسن نظامی کے مقصدِ تحریر کو سمجھنا۔
- طلبہ میں ہمدردی اور دوسروں کے ساتھ احسان کا معاملہ کرنے کی ترغیب پیدا کرنا۔

جب دہلی زندہ تھی اور ہندوستان کا دل کہلانے کا حق رکھتی تھی، لال قلعہ پر تیموریوں کا آخری نشان لہرا رہا تھا۔ انھی دنوں کا ذکر ہے کہ مرزا سلیم بہادر (جو ابوظفر بہادر شاہ کے بھائی تھے) اپنے مردانہ مکان میں بیٹھے ہوئے دوستوں سے بے تکلفانہ باتیں کر رہے تھے کہ اتنے میں زنان خانہ سے ایک لونڈی باہر آئی اور ادب سے عرض کیا کہ حضور! بیگم صاحبہ یاد فرماتی ہیں۔ مرزا سلیم فوراً محل میں چلے گئے اور تھوڑی دیر میں مغموم واپس آئے۔ ایک بے تکلف ندیم نے عرض کیا: ''خیر باشد! مزاج عالی مکدّر پاتا ہوں۔'' مرزا نے مسکرا کر جواب دیا: ''نہیں کچھ نہیں۔ بعض اوقات اماں حضرت خواہ مخواہ ناراض ہو جاتی ہیں۔ کل شام کو افطاری کے وقت تھمن خان گویا گا رہا تھا اور میرا دل بہلا رہا تھا۔ اس وقت اماں حضرت قرآن شریف پڑھا کرتی ہیں۔ اُن کو یہ شور غل ناگوار معلوم ہوا۔ آج ارشاد ہوا ہے کہ رمضان میں گانے بجانے کی محفلیں بند کر دی جائیں۔ بھلا میں اس تفریحی عادت کو کیوں کر چھوڑ سکتا ہوں۔ ادب کے لحاظ سے قبول تو کر لیا مگر اس پابندی سے جی اُلجھتا ہے۔ حیران ہوں کہ یہ سولہ دن کیوں کر بسر ہوں گے۔''

مصاحب نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا: ''حضور! یہ بھی کوئی پریشان ہونے کی بات ہے۔ شام کو افطاری سے پہلے جامع مسجد تشریف لے چلا کیجیے۔ عجب بہار ہوتی ہے۔ رنگ برنگ کے آدمی، طرح طرح کے جمگھٹے دیکھنے میں آئیں گے۔ خدا کے دن ہیں، خدا والوں کی بہار بھی دیکھیے۔''

مرزا نے اس صلاح کو پسند کیا اور دوسرے دن مصاحبوں کو لے کر جامع مسجد پہنچے۔ وہاں جا کر عجب عالم دیکھا۔ جگہ جگہ حلقہ بنائے لوگ بیٹھے ہیں۔ کہیں قرآن شریف کے دَور ہو رہے ہیں۔ رات کے قرآن سنانے والے حُفّاظ آپس میں ایک دوسرے کو قرآن سنا رہے ہیں۔ کہیں مسائلِ دین پر گفت گو ہو رہی ہے۔ دو عالم کسی فقہی مسئلہ پر بحث کرتے ہیں اور بیسیوں آدمی ارد گرد بیٹھے مزے سے سن رہے ہیں۔ کسی جگہ توجّہ اور مراقبے کا حلقہ ہے۔ کہیں کوئی صاحب وظائف میں مشغول ہیں۔ الغرض مسجد میں چاروں طرف اللہ والوں کا ہجوم ہے۔

کُلُّ جَدِیۡدٍ لَذِیۡذٌ۔[1] مرزا کو یہ نظارہ نہایت پسند آیا اور وقت بہت لُطف سے کٹ گیا۔ اتنے میں افطار کا وقت قریب آیا۔

(۱) ہر نئی چیز مزے دار معلوم ہوتی ہے۔

سیکڑوں خوان افطاری کے آنے لگے اور لوگوں میں افطاریاں تقسیم ہونے لگیں۔ خاص محل سلطانی سے متعدد خوان مکلّف چیزوں سے آراستہ روزانہ جامع مسجد میں بھیجے جاتے تھے تاکہ روزہ داروں میں افطاری تقسیم کی جائے۔ اس کے علاوہ قلعہ کی تمام بیگمات اور شہر کے سب اُمرا علیحدہ سے افطاری کے سامان بھیجتے تھے، اس لیے ان خوانوں کی گنتی سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ چوں کہ ہر امیر کوشش کرتا تھا کہ اس کا سامانِ افطاری دوسروں سے بڑھ کر رہے، اس لیے ریشمی رنگ برنگ کے خوان پوش اور ان پر منقّش جھالریں ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر ہوتی تھیں اور مسجد میں ان کی عجب آرائش ہو جاتی تھی۔

مرزا کے دل پر اس دینی چرچے اور شان و شوکت نے بڑا اثر ڈالا اور اب وہ برابر روزانہ مسجد میں آنے لگے۔ گھروں میں وہ دیکھتے کہ سیکڑوں فقرا کو سحری اور اوّل شب کا کھانا روزانہ شہر کی خانقاہوں اور مسجدوں میں بھجوایا جاتا تھا، یہ دن ان کے گھر میں بڑی برکت اور چہل پہل کے معلوم ہوتے تھے۔

مرزا سلیم کے ایک بھانجے مرزا شہ زور نوعمری کے سبب اکثر اپنے ماموں کی صحبت میں بے تکلف شریک ہوا کرتے تھے۔ ان کا بیان ہے کہ ایک تو وہ وقت تھا جو آج خواب و خیال کی طرح یاد آتا ہے اور ایک وہ وقت آیا کہ دہلی زیر و زبر ہو گئی۔ قلعہ برباد کر دیا گیا۔ امیروں کو پھانسیاں مل گئیں۔ ان کے گھر اُکھڑ گئے۔ ان کی بیگمات ماماگیری کرنے لگیں اور مسلمانوں کی سب شان و شوکت تاراج ہو گئی۔ اس کے بعد ایک دفعہ رمضان شریف کے مہینے میں جامع مسجد جانے کا اتفاق ہوا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ جگہ جگہ چولھے بنے ہوئے ہیں۔ سپاہی روٹیاں پکا رہے ہیں۔ گھوڑوں کے دانے دلے جا رہے ہیں۔ گھاس کے انبار لگے ہوئے ہیں اور شاہجہاں کی خوب صورت اور بے مثل مسجد اصطبل نظر آتی ہے اور پھر جب مسجد واگزاشت ہو گئی اور سرکار نے اس کو مسلمانوں کے حوالے کر دیا تو رمضان ہی کے مہینے میں پھر جانا ہوا۔ دیکھا کہ چند مسلمان میلے کچیلے پیوند لگے کپڑے پہنے بیٹھے ہیں۔ دو چار قرآن شریف کا دَور کر رہے ہیں اور کچھ اسی پریشان حالی میں بیٹھے وظیفہ پڑھ رہے ہیں۔ افطاری کے وقت چند آدمیوں نے کھجوریں اور دال سیو بانٹ دیے۔ کسی نے ترکاری کے قتلے تقسیم کر دیے۔ نہ وہ اگلا سا سماں، نہ وہ اگلی سی چہل پہل، نہ وہ پہلی سی شان و شوکت۔ یہ معلوم ہوتا تھا کہ بیچارے فلک کے مارے چند لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ اس کے بعد آج کل کا زمانہ بھی دیکھا جب کہ مسلمان چاروں طرف سے دب گئے ہیں۔ انگریزی تعلیم یافتہ مسلمان تو مسجد میں نظر ہی کم آتے ہیں۔ غریب غربا آئے تو ان سے رونق کیا خاک ہو سکتی ہے۔ پھر بھی غنیمت ہے کہ مسجد آباد ہے۔ اگر مسلمانوں کے افلاس کا یہی عالم رہا تو آیندہ خبر نہیں کیا نوبت آئے۔

مرزا شہ زور کی باتوں میں بڑا درد اور اثر تھا۔ ایک دن میں نے ان سے غدر کا قصہ اور تباہی کا فسانہ سننا چاہا۔ آنکھوں میں آنسو بھر لائے اور اس کے بیان کرنے میں عذر و مجبوری ظاہر کرنے لگے، لیکن جب میں نے زیادہ اصرار کیا تو اپنی دردناک کہانی اس طرح سنائی:

جب انگریزی توپوں نے، کرچوں اور سنگینوں نے، چکمانہ توڑ جوڑ نے، ہمارے ہاتھ سے تلوار چھین لی، تاج سر سے اُتار لیا، تخت پر قبضہ کر لیا، شہر میں آتش ناک گولیوں کا مینھ برس چکا، سات پردوں میں رہنے والیاں بے چادر ہو کر بازار میں اپنے وارثوں کی تڑپتی ہوئی لاشوں کو دیکھنے نکل آئیں، چھوٹے بن باپ کے بچے ابا ابا پکارتے ہوئے بے یار و مددگار پھرنے لگے، حضورِ ظلِ سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا، قلعہ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔ اس وقت میں نے بھی اپنی بوڑھی والدہ، کم سن بہن اور حاملہ بیوی کو ساتھ لے کر اور اُجڑے قافلے کا

سالار بن کر گھر سے کوچ کیا۔

ہم لوگ دو رتھوں میں سوار تھے۔ سیدھے غازی آباد کا رُخ کیا مگر بعد میں معلوم ہوا کہ وہ راستہ انگریزی لشکر کی جولان گاہ بنا ہوا ہے، اس لیے شاہدرہ سے واپس ہو کر قطب صاحب چلے اور وہاں پہنچ کر رات کو آرام کیا۔ اس کے بعد صبح آگے روانہ ہوئے۔ چھتر پور کے قریب گوجروں نے حملہ کیا اور سب سامان لُوٹ لیا مگر اتنی مہربانی کی کہ ہم کو زندہ چھوڑ دیا۔ وہ لق و دق جنگل، تین عورتوں کا ساتھ اور عورتیں بھی کیسی! ایک بڑھاپے سے لاچار، دو قدم چلنا دو بھر۔ دوسری بیمار اور حاملہ۔ تیسری دس برس کی نادان لڑکی۔ عورتیں روتی تھیں اور بَین کر کر کے روتی تھیں۔ میرا کلیجا ان کے بین سے پھٹا جاتا تھا۔ والدہ کہتی تھیں: الٰہی ہم کہاں جائیں۔ کس کا سہارا ڈھونڈیں۔ ہمارا تاج و تخت تو لُٹ گیا، ٹوٹا بوریا اور امن کی جگہ تو دے۔ اس بیمار پیٹ والی کو کہاں لے کر بیٹھوں؟ اس معصوم بچی کو کس کے حوالے کروں؟ جنگل کے درخت بھی ہمارے دشمن ہیں۔ کہیں سایہ نظر نہیں آتا۔ بہن کی یہ کیفیت تھی کہ وہ سہمی ہوئی کھڑی تھی اور ہم سب کا منھ تکتی تھی۔ مجھ کو اس کی معصومانہ بے کسی پر بڑا ترس آتا تھا۔ آخر مجبور ائیں نے عورتوں کو دلاسا دیا اور آگے چلنے کی ہمت بندھائی۔ گاؤں سامنے نظر آتا تھا۔ غریب عورتوں نے چلنا شروع کیا۔ والدہ صاحبہ قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتی تھیں اور سر پکڑ کر بیٹھ جاتی تھیں اور جب وہ یہ کہتیں: ''تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو تاج وروں کے ٹھوکریں مارتے تھے۔ قسمت نے ان کو بے بس کر دیا جو بے کسوں کے کام آتے تھے۔ ہم چنگیز کی نسل ہیں جس کی تلوار سے زمین کانپتی تھی۔ ہم تیمور کی اولاد ہیں جو ملکوں کا اور شہر یاروں کا شاہ تھا۔ ہم شاہجہاں کے گھر والے ہیں جس نے ایک قبر پر جواہر نگار بہار دکھادی اور دنیا میں بے نظیر مسجد دہلی کے اندر بنادی۔ ہم ہندوستان کے شہنشاہ کے کنبہ میں ہیں۔ ہم عزت والے تھے۔ زمین میں ہمیں کیوں ٹھکانا نہیں ملتا؟ وہ کیوں سرکشی کرتی ہے؟ آج ہم پر مصیبت ہے۔ آج ہم پر آسمان روتا ہے۔'' تو بدن کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے تھے۔ القصہ بہ ہزار دقت و دشواری گرتے پڑتے گاؤں میں پہنچے۔ یہ گاؤں مسلمان میواتیوں کا تھا۔ انھوں نے ہماری خاطر کی اور اپنی چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرا دیا۔

کچھ روز تو ان مسلمان گنواروں نے ہمارے کھانے پینے کی خبر رکھی اور چوپاڑ میں ہم کو ٹھہرائے رکھا، لیکن کب تک یہ بار اٹھا سکتے تھے۔ اُکتا گئے اور ایک دن مجھ سے کہنے لگے: ''میاں جی! چوپاڑ میں ایک برات آنے والی ہے۔ تُو دوسرے چھپر میں چلا جا اور رات دن ٹھالی (بے کار) بیٹھے کیا کرے ہے۔ کچھ کام کیوں نہیں کرتا؟'' میں نے کہا: ''بھائی! جہاں تم کہو گے وہیں جا پڑیں گے۔ ہمیں چوپاڑ میں رہنے کی ہوس نہیں ہے۔ جب فلک نے عالی شان محل چھین لیے تو اس کچے مکان پر ہم کیا ضد کریں گے اور رہی کام کرنے کی بات، سو میرا جی تو خود گھبراتا ہے، خالی بیٹھے بیٹھے طبیعت اُکتائی جاتی ہے۔ مجھ کو کوئی کام بتاؤ، ہو سکے گا تو آنکھوں سے کروں گا۔''

ان کا چودھری بولا: ''ہم نے کے بیرا (ہمیں کیا خبر) کہ تم کے کام (کیا کام) کر سکے ہے۔'' میں نے جواب دیا، ''میں سپاہی زادہ ہوں۔ تیغ و تفنگ چلانا میرا ہنر ہے، اس کے علاوہ اور کوئی کام نہیں جانتا۔'' گنوار ہنس کر کہنے لگے، نہ بابا یہاں تو ہل چلانا ہوگا۔ گھاس کھودنی پڑے گی۔ ہم نے تلوار کے ہنر کیا کرنے ہیں۔ گنوار کے اس جواب سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے اور جواب دیا: ''بھائیو! مجھ کو تو ہل چلانا اور گھاس کھودنی نہیں آتی۔'' مجھ کو روتا دیکھ کہ گنواروں کو رحم آ گیا اور بولے: ''اچھا! تُو ہمارے کھیت کی رکھوالی کیا کر اور تیری عورتیں ہمارے گاؤں کے کپڑے سی دیا کریں۔ فصل پر تجھ کو اناج دے دیا کریں گے جو تجھ کو برس دن کو کافی ہوگا۔''

چناں چہ یہی ہُوا کہ میں سارا دن کھیت پر جانور اُڑایا کرتا تھا اور گھر میں عورتیں کپڑے سیتی تھیں۔ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ بھادوں کا مہینا آیا اور گاؤں میں سب کو بخار آنے لگا۔ میری اہلیہ اور بہن کو بھی بخار نے آن دبایا۔ وہ گاؤں، وہاں دوا اور حکیم کا کیا ذکر، خود لوٹ پوٹ کر اچھے ہو جاتے ہیں، مگر ہم کو دواؤں کی عادت تھی۔ سخت تکلیف اُٹھانی پڑی۔ اسی حالت میں ایک دن اس زور کی بارش ہوئی کہ جنگل کا نالہ چڑھ آیا اور گاؤں میں کمر کمر پانی ہو گیا۔ گاؤں والے تو اس کے عادی تھے لیکن ہماری حالت اس طوفان کے سبب مرنے سے بدتر ہو گئی۔ چوں کہ پانی ایک دفعہ ہی رات کے وقت گھس آیا تھا، اس لیے ہماری عورتوں کی چارپائیاں بالکل ہی غرق آب ہو گئیں اور عورتیں چیخیں مارنے لگیں۔ آخر بڑی مشکل سے چھپر کی بلّیوں میں دو چارپائیاں اَڑا کر عورتوں کو ان پر بٹھایا۔ پانی گھنٹا بھر میں اُتر گیا مگر غضب یہ ہوا کہ کھانے کا اناج اور اوڑھنے بچھانے کے کپڑے تر کر گیا۔ پچھلی رات میری بیوی کے درد زہ شروع ہوا اور ساتھ ہی جاڑے سے بخار بھی لایا۔ اُس وقت کی پریشانی بس بیان کرنے کے قابل نہیں۔ اندھیرا گھپ، مینھ کی جھڑی، کپڑے سب گیلے۔ آگ کا سامان ناممکن۔ حیران تھے، الٰہی! کیا انتظام کیا جائے؟ درد بڑھنا شروع ہوا اور مریضہ کی حالت نہایت ابتر ہو گئی۔ یہاں تک کہ وہ تڑپنے لگی اور تڑپتے تڑپتے جان دے دی۔ بچہ پیٹ ہی میں رہا۔ چوں کہ وہ ساری عمر ناز و نعمت میں پلی تھیں، غدر کی مصیبتیں ہی ان کی ہلاکت کے لیے کافی تھیں۔ خیر اس وقت تو جان بچ گئی، مگر یہ بعد کا جھٹکا ایسا بڑا لگا کہ جان لے کر گیا۔ صبح ہو گئی۔ گاؤں والوں کو خبر ہوئی تو انھوں نے کفن وغیرہ منگوا دیا اور دوپہر تک یہ محتاج شہزادی گورِ غریباں میں ہمیشہ کے لیے جا سوئی۔

اب ہم کو کھانے کی فکر ہوئی کیوں کہ اناج سب بھیگ کر سڑ گیا تھا۔ گاؤں والوں سے بھی مانگتے ہوئے لحاظ آتا تھا۔ وہ بھی ہماری طرح اس مصیبت میں گرفتار تھے، تاہم بے چارے گاؤں کے چودھری کو خود ہی خیال ہوا اور اس نے قطب صاحب سے ایک روپے کا آٹا منگوا دیا۔ وہ آٹا نصف کے قریب خرچ ہوا ہوگا کہ رمضان شریف کا چاند نظر آیا۔ والدہ صاحبہ کا دل بہت نازک تھا۔ وہ ہر وقت گزشتہ زمانے کو یاد کیا کرتی تھیں۔ رمضان کا چاند دیکھ کر انھوں نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا اور چپ ہو گئیں۔ میں سمجھ گیا کہ ان کو پچھلا زمانہ یاد آ رہا ہے۔ تسلی کی باتیں کرنے لگا، جس سے ان کو کچھ ڈھارس ہو گئی۔

چار پانچ دن تو آرام سے گزر گئے، مگر جب آٹا ختم ہو چکا تو بڑی مشکل درپیش ہوئی۔ سوال کرتے ہوئے شرم آتی تھی اور پاس ایک کوڑی نہ تھی۔ شام کو پانی سے روزہ کھولا۔ بھوک کے مارے کلیجہ منھ کو آتا تھا۔ والدہ صاحبہ کی عادت تھی کہ اس قسم کی تکلیف کے وقت بیان کر کے بہت رویا کرتی تھیں، مگر آج بڑے اطمینان سے خاموش تھیں۔ ان کی خاموشی و اطمینان سے میرے دل کو بھی سہارا ہوا اور چھوٹی بہن کو جس کے چہرے پر بھوک کے مارے ہوائیاں اُڑ رہی تھیں، دلاسا دینے لگا۔ وہ معصوم بھی میرے سمجھانے پر نڈھال ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔ بھوک میں نیند کہاں آتی ہے، بس ایک غوطہ سا تھا۔ اس غوطہ اور ناتوانی کی حالت میں سحری کا وقت آ گیا۔ والدہ صاحبہ اُٹھیں اور تہجد کی نماز کے بعد جن دردناک الفاظ میں انھوں نے دعا مانگی، ان کا نقل کرنا محال ہے۔ حاصلِ مطلب یہ ہے کہ انھوں نے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا:

"ہم نے ایسا کیا قصور کیا ہے جس کی سزا یہ مل رہی ہے۔ رمضان کے مہینے میں ہمارے گھر سے سیکڑوں محتاجوں کو کھانا ملتا تھا اور

آج ہم خود دانے دانے کو محتاج ہیں اور روزہ پر روزہ رکھ رہے ہیں۔ خداوندا! اگر ہم سے قصور ہوا ہے تو اس معصوم بچی نے کیا خطا کی جس کے منھ میں کل سے ایک کھیل اُڑ کر نہیں گئی۔''

دوسرا دن بھی یوں ہی گزر گیا اور فاقے میں روزہ در روزہ رکھا۔ شام کے قریب چودھری کا آدمی دودھ اور میٹھے چاول لایا اور بولا: ''آج ہمارے ہاں نیاز تھی۔ یہ اس کا کھانا ہے اور یہ پانچ روپے زکوٰۃ کے ہیں۔ ہر سال بکریوں کی زکوٰۃ میں بکری دیا کرتے ہیں، مگر اب کے نقد دے دیا ہے۔''

یہ کھانا اور روپے مجھ کو ایسی نعمت معلوم ہوئے گویا بادشاہت مل گئی۔ خوشی خوشی والدہ کے آگے سارا قصہ کہا۔ کہتا جاتا تھا اور خدا کا شکرانہ بھیجتا جاتا تھا مگر یہ خبر نہ تھی کہ گردشِ فلک نے مرد کے خیال پر تو اثر ڈال دیا لیکن عورت ذات جوں کی توں اپنی قدیمی غیرت داری پر قائم ہے۔ چناں چہ میں نے دیکھا کہ والدہ کا رنگ متغیر ہو گیا۔ باوجود فاقہ کی ناتوانی کے انھوں نے تیور بدل کر کہا:

''تُف ہے تیری غیرت پر۔ خیرات اور زکوٰۃ لے کر آیا ہے اور خوش ہوتا ہے۔ ارے اس سے مر جانا بہتر تھا۔ اگرچہ ہم مٹ گئے مگر ہماری حرارت نہیں مٹی۔ میدان میں نکل کر مر جانا یا مار ڈالنا اور تلوار کے زور سے روٹی لینا ہمارا کام ہے۔ صدقہ خوری ہمارا شیوہ نہیں ہے۔''

والدہ کی ان باتوں سے مجھے پسینا آ گیا اور شرم کے مارے ہاتھ پاؤں ٹھنڈے ہو گئے۔ چاہا کہ اُٹھ کر یہ چیزیں واپس کر آؤں مگر والدہ نے روکا اور کہا: ''خدا ہی کو یہ منظور ہے تو ہم کیا کریں۔ سب کچھ سہنا ہوگا۔'' یہ کہ کر کھانا رکھ لیا اور روزہ کھولنے کے بعد ہم سب نے مل کر کھا لیا۔ پانچ روپے کا آٹا منگوایا گیا جس سے رمضان خیر و خوبی سے بسر ہو گیا۔ اس کے بعد چھے مہینے گاؤں میں رہے۔ پھر دہلی چلے آئے۔ یہاں آ کر والدہ کا انتقال ہو گیا اور بہن کی شادی کر دی۔ انگریزی سرکار نے میری بھی پانچ روپے ماہوار پنشن مقرر کر دی جس پر آج کل زندگی کا انحصار ہے۔

(بیگمات کے آنسو)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) ''جب دہلی زندہ تھی'' سے کیا مراد ہے؟

(ب) ''خیر باشد! مزاج عالی مکدر پاتا ہوں۔'' اس جملے کی وضاحت کریں۔

(ج) مرزا سلیم بہادر کون تھے؟

(د) جامع مسجد میں مرزا صاحب نے کیا منظر دیکھا؟

(ہ) مرزا صاحب روزانہ مسجد کیوں آنے لگے؟

(و) مرزا شہ زور کی والدہ کس بات پر ناراض ہوئیں اور انھوں نے کیا کہا؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(i) سبق ''فاقہ میں روزہ'' خواجہ حسن نظامی کی تصنیف سے ماخوذ ہے:

(الف) غدرِ دہلی کے افسانے (ب) سی پارۂ دل (ج) بیگمات کے آنسو (د) مضامینِ حسن نظامی

(ii) سبق ''فاقہ میں روزہ'' اصنافِ ادب کے لحاظ سے ہے:

(الف) ناول (ب) ڈراما (ج) داستان (د) افسانہ

(iii) مرزا شہ زور رشتے میں ابوظفر بہادر شاہ کے تھے:

(الف) بھتیجے (ب) بھانجے (ج) بھائی (د) رضاعی بھائی

(iv) متن کے مطابق جامع مسجد دہلی بنوائی تھی:

(الف) شاہجہان نے (ب) اورنگ زیب عالمگیر نے (ج) ابوظفر بہادر شاہ نے (د) نصیر الدین ہمایوں نے

(v) قلعہ چھوڑتے وقت مرزا شہ زور کے ساتھ تھی:

(الف) والدہ، بہن اور بیوی (ب) بیٹی، بہن اور بیوی (ج) والدہ، بیٹی اور بیوی (د) والدہ، بہن اور بیٹی

۳۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں:

(الف) ہم لوگ دو ــــــ میں سوار تھے۔

(ب) حضور ظلِ سبحانی جن پر ہم سب کا سہارا تھا، ــــــ چھوڑ کر باہر نکل گئے۔

(ج) تقدیر ان کو ٹھوکریں کھلواتی ہے جو ــــــ کے ٹھوکریں مارتے تھے۔

(د) وہ معصوم بھی میرے سمجھانے پر ــــــ ہو کر چارپائی پر جا پڑی اور تھوڑی دیر میں سو گئی۔

(ہ) اس غوطہ اور ناتوانی کی حالت میں ــــــ کا وقت آ گیا۔

(و) اس کے بعد چھے مہینے گاؤں میں رہے، پھر ــــــ چلے آئے۔

۴۔ طلبہ سبق "فاقہ میں روزہ" کے متن کو غور سے پڑھیں اور اسے مختصر مگر جامع انداز میں ایک دوسرے کو سنائیں۔

۵۔ طلبہ جماعت دہم تک مغلیہ حکمرانوں کے بارے میں پڑھ چکے ہیں۔ انھیں ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے احوال بھی ازبر ہیں۔ اپنی سابق واقفیت کو مدِ نظر رکھتے ہوئے بہادر شاہ ظفر کی حکومت کے زوال کے اسباب اور نتائج ایک دوسرے کو بتائیں۔

۶۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں:

بدعنوانی انگریزی زبان کے لفظ 'کرپشن' کا اُردو ترجمہ ہے۔ ہر وہ برائی جو معاشرے میں کسی بھی قسم کے فساد کا باعث بنے "کرپشن" کہلاتی ہے۔ سود خوری، رشوت ستانی، سفارش، وعدہ خلافی، جھوٹ، ملاوٹ، تعصب، اقربا پروری، بددیانتی، ہر طرح کی چوری اور دیگر تمام سماجی برائیاں کرپشن ہی کے ذیل میں آتی ہیں۔ اگر ہم ایک خوش حال، منظم اور پُرامن معاشرہ چاہتے ہیں تو ان تمام برائیوں سے نجات ناگزیر ہے۔ دینِ اسلام نہ صرف تمام قسم کی کرپشن کو ختم کرنے کی تاکید کرتا ہے بلکہ حضور ﷺ کی سیرتِ اقدس ایسے تمام پہلوؤں سے سجی ہوئی ہے جس کی پیروی کر کے تمام معاشرتی برائیوں سے بچا جاسکتا ہے اور معاشرے کو خوش حال اور مثالی بنایا جاسکتا ہے۔ انسدادِ بدعنوانی کے لیے لازم ہے کہ تعلیم کو عام کر کے معاشرتی شعور کو بیدار کیا جائے۔ جائز و ناجائز اور حلال و حرام کے امتیاز کو لوگوں کے اذہان و قلوب میں بسایا جائے۔ اس کے لیے میڈیا کا استعمال بھی کیا جاسکتا ہے۔ اگر ہم سچے اور پکے مسلمان بن جائیں اور حب الوطنی کے تقاضوں کو پورا کرنے لگیں تو یقیناً ہمارا معاشرہ اور ہمارا ملک تمام برائیوں سے پاک ہو سکتا ہے۔

سوالات:

- بدعنوانی کے لیے انگریزی میں کون سا لفظ مستعمل ہے؟
- عبارت کے مطابق کون کون سی سماجی برائیاں بدعنوانی میں شامل ہیں؟
- اسلامی تناظر میں معاشرے کو خوش حال اور مثالی کس طرح بنایا جاسکتا ہے؟
- بدعنوانی کی روک تھام کے لیے معاشرتی شعور کیسے بیدار ہوگا؟
- اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

جملے کے اجزا

مبتدا اور خبر: جملے کے دو اجزا ہوتے ہیں:

پہلے جز میں کسی شخص یا شے کا ذکر کیا جاتا ہے اور دوسرے جز میں اس شخص یا شے کے بارے میں کچھ بتایا جاتا ہے۔ قواعد کی رو سے جملے کے اس پہلے جز کو مبتدا اور دوسرے جز کو خبر کہتے ہیں۔ درج ذیل مثالوں میں جملے کے اجزا کی وضاحت پیش کی جارہی ہے:

(الف) بھیڑ اور بھیڑیا، ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں۔	مبتدا: بھیڑ اور بھیڑیا	خبر: ایک گھاٹ پانی پیتے ہیں
(ب) میں اور تم مل کر جائیں گے۔	مبتدا: میں اور تم	خبر: مل کر جائیں گے
(ج) اچھا آدمی، اچھی بات کہے گا۔	مبتدا: اچھا آدمی	خبر: اچھی بات کہے گا۔

۷۔ اس سبق میں سے کوئی سے پانچ جملے منتخب کریں اور مبتدا اور خبر کے حوالے سے ان کے اجزا بیان کریں۔

۸۔ درج ذیل تراکیب کی وضاحت جملوں میں استعمال کے ذریعے کریں:

خواہ مخواہ، خوان پوش، لہولہب، بے تکلف ، بے یارومددگار ، لق ودق، بہ ہزار دقت ودشواری ، نازونعمت

۹۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہوجائے:

خدا خدا کر کے، ڈٹ جانا، دل میں گھر کرنا، دل پاش پاش ہونا،

حالت غیر ہونا، دل میں بدی آنا، سنّاٹے میں آجانا

۱۰۔ سبق "فاقہ میں روزہ" کا خلاصہ تحریر کریں۔

۱۱۔ سیاق وسباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح کریں اور حوالۂ متن بھی درج کریں۔

"والدہ کی ان باتوں سے مجھے۔۔۔۔۔۔۔آج کل زندگی کا انحصار ہے۔"

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- خواجہ حسن نظامی کی کتاب "بیگمات کے آنسو" کا مطالعہ کریں۔
- "بیگمات کے آنسو" کے مجموعے میں سے "بنتِ بہادر شاہ" کا مطالعہ کریں اور اس پر باہمی گفتگو کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو خواجہ حسن نظامی کی شخصیت اور فن سے متعارف کرائیں۔
- طلبہ کو جنگِ آزادی ۱۸۵۷ء کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔
- طلبہ کو مشقی سوالات اور سرگرمیوں کے حوالے سے رہنمائی فراہم کریں۔

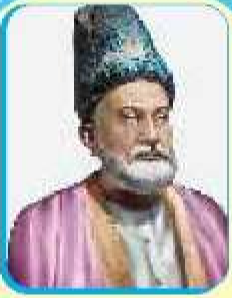

اسداللہ خاں غالب

(۱۷۹۷ء-۱۸۶۹ء)

اسداللہ خاں نام، گھر پر ''مرزا نوشہ'' پکارے جاتے تھے۔ پہلے ''اسد'' تخلص کیا پھر ''غالب''۔ آگرے میں پیدا ہوئے۔ نسلاً ایک تُرک تھے۔ والد عبداللہ بیگ سپاہی پیشہ تھے۔ غالب پانچ برس کے تھے کہ اُن کے والد ایک معرکے میں مارے گئے۔ غالب کی پرورش ان کے چچا نے سنبھالی لیکن چار سال بعد وہ بھی وفات پا گئے اور غالب اپنے نانا کی نگرانی میں آ گئے۔ عنفوانِ شباب بڑی بے فکری میں گزرا۔

غالب بنیادی طور پر شاعر تھے اور اپنی فارسی شاعری پر فخر کیا کرتے تھے۔ ابتدا میں خط بھی فارسی میں لکھتے تھے لیکن بعد میں کچھ تو اپنی بڑھتی ہوئی عمر اور کچھ اپنی جدّت پسندی کے باعث اُردو میں خط لکھنے شروع کیے۔ انھوں نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو بہت سے خط لکھے جن کے مجموعے ''عُودِ ہندی'' اور ''اُردوئے مُعلّٰی'' کے نام سے ان کی زندگی ہی میں مرتب ہو گئے تھے۔

غالب اپنے عہد اور زمانے کی ایک نابغۂ روزگار شخصیت تھے اور اپنے دور کے علمی و ادبی کمالات کے عکاس تھے۔ ان کی شخصیت اپنے تمام تر رچاؤ اور وسعت کے ساتھ ان کے خطوط میں بھی جھلکتی ہے۔ ان کے خطوط کی اہم خصوصیت ان کا اسلوبِ بیان اور زبان ہے۔ ان کے خطوط بے ساختگی، بے تکلفی، طنز و مزاح اور تازگی و شوخی کے عناصر سے بھرپور ہیں۔ ان کی زبان سادہ، پُرکار اور جوش و ولولہ سے لبریز ہے۔ کہیں کہیں مشکل الفاظ و تراکیب بھی ہیں لیکن وہ بھی غالب کی علمیت، ظرافت اور جدت پسندی ہی کی جھلک ہیں۔ ان کے خطوط میں زبان و بیان کی روانی بے مثال ہے۔ وہ اکثر و بیشتر مکالمہ اور قوافی کا استعمال بھی کرتے ہیں لیکن اس میں اکثر اوقات تصنع کے بجائے بے ساختگی اور ظرافت کا اظہار ہوتا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ دو بے تکلف دوست آمنے سامنے بیٹھے آپس میں بات چیت کر رہے ہیں۔ جیسا کہ وہ خود لکھتے ہیں:

''میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو، ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔''

لیکن اس بے تکلفی و سادگی کے باوجود ان کے خطوط میں علمی و ادبی شان پائی جاتی ہے۔ مرزا غالب کے دو خط شاملِ کتاب ہیں جو علاءالدین احمد خان علائی (۱) اور مرزا ہرگوپال تفتہ (۲) کے نام ہیں۔

---

(۱) علاءالدین احمد خاں علائی: مرزا غالب، علائی کو اپنا خلیفۂ ثانی سمجھتے تھے۔ یہ اردو اور فارسی کے بہت اچھے شاعر اور ترکی زبان بھی بخوبی جانتے تھے۔ ان کی وفات ۱۸۸۳ء میں ہوئی۔

(۲) مرزا ہرگوپال تفتہ: مرزا تفتہ، مرزا غالب کے بہت سعادت مند اور فرماں بردار شاگرد تھے۔ مرزا غالب انھیں پیار سے ''مرزا تفتہ'' کہتے تھے۔

سبق:۵

مکاتیبِ غالب

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کے علمی اور ادبی ذوق کی تربیت کرنا۔
- غالب کے خطوط سے غالب کے تاریخی موقف، سیاسی اور سماجی تبدیلیوں اور ثقافتی پہلوؤں کے بارے میں جاننا۔
- مکاتیبِ غالب کے توسط سے غالب کے ذہنی، فکری اُفق اور خیالات کو سمجھنا۔
- طلبہ کی تحریری اور تقریری صلاحیتوں میں اضافہ کرنا۔
- طلبہ کو بتانا کہ نثر نگاری میں غالب کے خطوط کو کس قدر اہمیت حاصل ہے اور یہ کہ غالب نے خطوط نویسی میں منفرد اسلوب کی بنیاد رکھی۔

بنام علاء الدّین علائی

جانِ غالب!

تم تو ثمر نورس [1] ہو، اس نہال [2] کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشو و نما پائی ہے اور میں ہوا خواہ و سایہ نشین اس نہال کا رہا ہوں، کیوں کر تم مجھ کو عزیز نہ ہوگے؟ رہی دید وا دید، اس کی دو صورتیں ہیں: تم دلّی میں آؤ یا میں لوہارو آؤں۔ تم مجبور، میں معذور۔ خود کہتا ہوں کہ میرا عذر زنہار مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو کہ میں کون ہوں اور ماجرا کیا ہے۔

سنو! عالم دو ہیں: ایک عالمِ ارواح اور ایک عالمِ آب و گِل۔ حاکم ان دونوں عالموں کا وہ ایک ہے جو خود فرماتا ہے:

لِمَنِ الْمُلْكُ الْيَوْمَ اور پھر آپ جواب دیتا ہے: لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ

ہر چند قاعدۂ عام یہ ہے کہ عالمِ آب و گِل کے مجرم، عالمِ ارواح میں سزا پاتے ہیں، لیکن یوں بھی ہوا ہے کہ عالمِ ارواح کے گناہ گار کو دنیا میں بھیج کر سزا دیتے ہیں۔ چناں چہ میں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں رُوبکاری کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔ تیرہ برس حوالات میں رہا۔ ۷ رجب ۱۲۲۵ھ کو میرے واسطے حکمِ دوام حبس صادر ہوا۔ ایک بیڑی میرے پاؤں میں ڈال دی اور دلّی شہر کو زنداں مقرر کیا اور مجھے اس زنداں میں ڈال دیا۔

فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔ برسوں کے بعد جیل خانے سے بھاگا۔ تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ پایانِ کار مجھے کلکتہ سے پکڑ لائے اور پھر اسی محبس میں بٹھا دیا۔ جب دیکھا کہ قیدی گریز پا ہے، دو ہتھکڑیاں اور بڑھا دیں۔ پاؤں بیڑی سے فگار، ہاتھ ہتھکڑیوں سے زخم دار، مشقتِ مقرری اور مشکل ہو گئی۔ طاقت یک قلم زائل ہو گئی۔ بے حیا ہوں۔ سالِ گزشتہ بیڑی کو زاویۂ زندان میں چھوڑ مع

(۱) نواب امین الدین احمد خاں، والیِ لوہارو کے بڑے صاحب زادے اور وارثِ ریاست

(۲) امین الدین احمد خاں، والیِ لوہارو

دونوں ہتھکڑیوں[۱] کے بھاگا۔ میرٹھ، مراد آباد ہوتا ہوا رام پور پہنچا۔ کچھ دن کم دو مہینے وہاں رہا تھا کہ پھر پکڑا آیا۔ اب عہد کیا کہ پھر نہ بھاگوں گا۔ بھاگوں گا کیا؟ بھاگنے کی طاقت بھی تو نہ رہی۔ حکمِ رہائی دیکھیے کب صادر ہو۔ ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ اسی ماہِ ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ میں چھوٹ جاؤں گا۔ بہر تقدیر بعدِ رہائی کے تو آدمی سوائے اپنے گھر کے اور کہیں نہیں جاتا۔ میں بھی بعدِ نجات سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔

فرخ آں روز کہ از خانۂ زنداں بروم
سوئے شہر خود ازیں وادیِ ویراں بروم[۲]

ذی الحجہ ۱۲۷۷ھ
(جون ۱۸۶۱ء)

غالب

بنام مرزا ہرگوپال تفتہ

بھائی!

تم سچ کہتے ہو کہ بہت مسودے اصلاح کے واسطے فراہم ہوئے ہیں، مگر یہ نہ سمجھنا کہ تمھارے ہی قصائد پڑے ہیں۔ نواب صاحب کی غزلیں بھی اسی طرح دھری ہوئی ہیں۔ برسات کا حال تمھیں بھی معلوم ہے اور یہ بھی تم جانتے ہو کہ میرا مکان گھر کا نہیں ہے، کرائے کی حویلی میں رہتا ہوں۔ جولائی سے مینھ شروع ہوا۔ شہر میں سیکڑوں مکان گرے اور مینھ کی نئی صورت، دن رات میں دو چار بار برسے اور ہر بار اس زور سے کہ ندی نالے بہ نکلیں۔ بالا خانے کا جو دالان میرے اُٹھنے بیٹھنے، سونے جاگنے، جینے مرنے کا محل ہے، اگرچہ گرا نہیں لیکن چھت چھلنی ہوگئی۔ کہیں لگن، کہیں چلمچی، کہیں اُگال دان رکھ دیا۔ قلم دان، کتابیں اٹھا کر توشے خانے کی کوٹھری میں رکھ دیے۔ مالک مرمت کی طرف متوجہ نہیں۔ کشتیِ نوح میں تین مہینے رہنے کا اتفاق ہوا۔ اب نجات ہوئی ہے۔ نواب صاحب کی غزلیں اور تمھارے قصائد دیکھے جائیں گے۔ میر بادشاہ میرے پاس آئے تھے۔ تمھاری خیر و عافیت اُن سے معلوم ہوئی تھی۔ میر قاسم علی صاحب مجھ سے نہیں ملے۔ پرسوں سے

(۱) باقر علی خاں اور حسین علی خاں، فرزندانِ عارف۔
(۲) میرے لیے وہ دن کس قدر خوش قسمتی کا حامل ہوگا جس دن میں اس قید خانے (دنیا) سے یعنی اس ویران وادی سے اپنے (چھتے پتے) شہر (عالمِ ارواح) کی طرف جاؤں گا۔

نواب مصطفیٰ خاں صاحب یہاں آئے ہوئے ہیں۔ایک ملاقات ان سے ہوئی ہے۔ابھی یہیں رہیں گے، بیمار ہیں، احسن اللہ خاں معالج ہیں، فصد ہو چکی ہے، جونکیں لگ چکی ہیں، اب مُسہل کی فکر ہے، سوا اس کے سب طرح کی خیر و عافیت ہے۔ مَیں ناتواں بہت ہو گیا ہوں، گویا صاحبِ فراش ہوں۔کوئی شخص نیا تکلّف کی ملاقات کا آ جائے تو اٹھ بیٹھتا ہوں، ورنہ پڑا رہتا ہوں۔ لیٹے لیٹے خط لکھتا ہوں، لیٹے لیٹے مسوّدات دیکھتا ہوں۔اللہ! اللہ! اللہ!

صبحِ جمعہ ۱۴رماہِ اکتوبر ۱۸۶۴ء

غالب

(خطوطِ غالب مرتبہ مولانا غلام رسول مہرؔ)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) علاء الدین علائی کے نام خط میں غالب نے کس کس عالم کا ذکر کیا ہے؟

(ب) غالب کے خیال میں عام قاعدہ کے مطابق عالمِ آب و گِل کے مجرم کہاں سزا پاتے ہیں؟

(ج) بیڑی اور ہتھکڑیوں سے غالب کیا مراد لیتے ہیں؟ وضاحت کریں۔

(د) ''کشتیِ نوح'' قواعد کی رو سے کیا ہے؟ وضاحت کریں۔

(ہ) مرزا ہر گوپال تفتہ کے نام لکھے گئے خط میں مرزا غالب نے کن برتنوں کا ذکر کیا ہے؟

(و) نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ کی بیماری کی کیا صورتِ حال بیان کی گئی ہے؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) خط کا متبادل لفظ ہے:

(الف) مراسلہ (ب) خریطہ (ج) قلم (د) کاغذ

(ii) ''جانِ غالب! تم تو ثمرِ نورس ہو اس نہال کے جس نے میری آنکھوں کے سامنے نشوونما پائی ہے۔'' غالب نے یہ جملہ لکھا:

(الف) مرزا ہر گوپال تفتہ کو (ب) علاء الدین علائی کو

(ج) نواب مصطفیٰ خاں کو (د) میر قاسم علی کو

(iii) خط کے مطابق علاء الدین علائی کا مسکن ہے:

(الف) دہلی (ب) لوہارو (ج) لکھنؤ (د) رام پور

(iv) غالب نے اپنے آپ کو گناہ گار کہا ہے:

(الف) عالمِ ارواح کا (ب) عالمِ آب وگل کا (ج) عالمِ برزخ کا (د) عالمِ بالا

(v) مرزا ہرگوپال تفتہ نے غالب کو اصلاح کے لیے بھیجا:

(الف) قصائد (ب) غزلیں (ج) مرثیے (د) حمدیں اور نعتیں

۳۔ درج ذیل الفاظ وتراکیب کے معانی لکھیں:

زائل ہونا، احتمال، محبس، مسموع، مسودہ، بلادِ شرقیہ، قصد

۴۔ متن کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں:

(الف) میرا عذر ـــــــ مسموع نہ ہو جب تک نہ سمجھ لو۔

(ب) دلّی شہر کو زندان مقرر کیا اور مجھے اس ـــــــ میں ڈال دیا۔

(ج) ہیں آٹھویں رجب ۱۲۱۲ھ میں ـــــــ کے واسطے یہاں بھیجا گیا۔

(د) میں بھی بعدِ نجات سیدھا ـــــــ کو چلا جاؤں گا۔

(ہ) میں ناتواں، بہت ہو گیا ہوں، گویا ـــــــ ہوں۔

۵۔ کالم "الف" میں دیے گئے الفاظ کو کالم "ب" کے متعلقہ الفاظ سے ملائیں:

کالم: الف	کالم: ب
ہجر	آواز
زمزمہ	نثر
خوش	نالے
نظم	زندان
ندی	پرواز
ہتھکڑی	وصال

۶۔ طلبہ باہمی گفت وشنید سے درج ذیل بیانات میں سے صحیح اور غلط کی نشان دہی کریں:

(الف) غالب نے لکھا کہ میں تین برس بلادِ شرقیہ میں پھرتا رہا۔ صحیح / غلط

(ب) "جانِ غالب! تم تو عمرِ نورس ہو۔" غالب کے یہ الفاظ مرزا تفتہ کے لیے ہیں۔ صحیح / غلط

(ج) نواب مصطفیٰ خاں، احسن اللہ خاں کے معالج تھے۔ صحیح / غلط

(د) "خطوطِ غالب" مولانا غلام رسول مہر کی مرتبہ کتاب ہے۔ صحیح / غلط

۷۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں:

جدید سائنسی ایجادات نے مواصلات کے نظام میں اَن گنت تبدیلیاں برپا کر دی ہیں۔ ریڈیو، ٹیلی وژن، ٹیلی فون، موبائل فون، فیکس اور انٹرنیٹ، وہ ایجادات ہیں جن کے سبب ہم ساری دنیا کو اپنے سامنے موجود پاتے ہیں۔ اب یہ ممکن ہو چکا ہے کہ ہم کسی بھی وقت اور کسی بھی جگہ ہزاروں میل دور بیٹھے کسی بھی شخص کو براہِ راست دیکھ سکتے ہیں اور اس سے گفت گو کر سکتے ہیں۔ انٹرنیٹ پر ای میل کے ذریعے چند سیکنڈ میں ہزاروں کلومیٹر دور دوستوں کو پیغامات، مضامین، کہانیاں، اسباق اور اشعار وغیرہ بھیجے جا سکتے ہیں۔ موجودہ دور میں موبائل فون سے بھی کمپیوٹر اور انٹرنیٹ کا کام لیا جا رہا ہے۔ طلبہ کمپیوٹر کو سامنے رکھ کر انٹرنیٹ کے ذریعے کسی بھی تعلیمی ادارے، کسی بھی شعبۂ تعلیم اور کسی بھی کتاب کے بارے میں بھرپور معلومات حاصل کر سکتے ہیں۔ ان سہولیات نے ہمارے درس و تدریس کے نظام کو بہت مؤثر، علاج معالجے کی مستند معلومات کی فراہمی کو آسان اور معلوماتِ عامہ تک عام آدمی کی رسائی کو ممکن بنا دیا ہے۔

سوالات:

- عبارت کے حوالے سے بتائیں کہ کن سائنسی ایجادات کا تعلق مواصلات کے نظام سے ہے؟
- انٹرنیٹ کے کیا فوائد ہیں؟
- موجودہ دور میں موبائل فون سے کیا کیا کام لیا جا سکتا ہے؟
- عبارت میں جدید مواصلاتی سہولیات سے فائدہ حاصل کرنے کے لیے کن دو اہم شعبوں کا ذکر کیا گیا ہے؟
- اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

حروفِ ندائیہ / فجائیہ (!): ندائیہ اور فجائیہ کے جملوں کے لیے اگرچہ ایک ہی علامت (!) استعمال ہوتی ہے لیکن دونوں جملے اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے مختلف ہوتے ہیں۔

ندائیہ (!): ندائیہ کا لفظ ندا سے بنا ہے جس کے معنی ہیں آواز دینا، پکارنا، مخاطب کرنا، بلانا وغیرہ۔ مثلاً:

(الف) ارے لڑکے! میری بات سنو۔ (ب) سبزی والے! ذرا رکنا۔

(ج) حضرات! ایک ضروری اعلان سنیے۔ (د) عزیز طلبہ! آج ہم حکایاتِ سعدیؒ کے متعلق گفت گو کریں گے۔

فجائیہ (!): فجائیہ عربی زبان کا لفظ ہے۔ جس کے معنی ہیں اچانک، فوراً، یکایک وغیرہ۔ اُردو زبان میں جب کسی جوش، غم و غصے، حیرت و تعجب، نفرت، خوف، تمنا، تحسین یا تحقیر جیسے کسی جذبے کا اظہار کیا جائے تو ایسے جملے یا لفظ کے بعد (!) کی علامت استعمال کی جاتی ہے۔ مثلاً:

(الف) حروفِ تاسف: افسوس! اُس نے میری قدر نہ کی۔

(ب) حروفِ تعجب: سبحان اللہ! کتنا سہانا موسم ہے۔

(ج) حروفِ نفرین: لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ! میں نے آج یہ کس کی صورت دیکھ لی۔

(د) حروفِ تمنّا: کاش! تم نے محنت کی ہوتی۔

(ہ) حروفِ تحسین: واہ وا! کیا کارکردگی دکھائی آپ نے۔

۸۔ طلبہ مکاتیبِ غالب کے زیرِ عنوان دونوں خطوط توجہ سے پڑھیں اور ندائیہ/ فجائیہ حروف تلاش کر کے اپنی نوٹ بک میں درج کریں۔

۹۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کریں اور حوالۂ متن بھی درج کریں:

- ''فکرِ نظم و نثر کو مشقت ٹھہرایا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔سیدھا عالمِ ارواح کو چلا جاؤں گا۔''
- ''میر بادشاہ میرے پاس آئے۔۔۔۔۔۔۔مسوّدات دیکھتا ہوں۔ اللہ! اللہ! اللہ!''

سرگرمی برائے طلبہ:

- اس سبق کی روشنی میں خط کے اجزا کو مدِ نظر رکھتے ہوئے آپ اپنے دوست کو ''خط کی جدید شکل ای میل ہے'' کے حوالے سے خط لکھیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو انفارمیشن ٹیکنالوجی (پرنٹ اور الیکٹرانک میڈیا) کے جدید ذرائع سے متعلق آگاہ کریں۔
- طلبہ کو تختۂ تحریر کی مدد سے ندائیہ اور فجائیہ کی مزید مثالیں دیں۔
- خطوط نویسی کے حوالے سے طلبہ کو انٹرنیٹ کی مدد سے قائدِ اعظمؒ اور علامہ اقبالؒ کے خطوط کے عکس دکھائیں۔

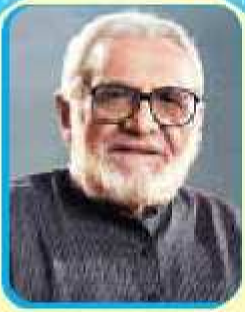

اشفاق احمد

(۱۹۲۵ء - ۲۰۰۴ء)

اشفاق احمد خاں: المعروف تلقین شاہ ہوشیار پور (مشرقی پنجاب، انڈیا) کے ایک چھوٹے سے گاؤں خان پور میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد محمد خاں محکمہ لائیو سٹاک میں ڈاکٹر تھے۔ میٹرک فیروز پور کے نواحی قصبے مکستر اور ایف۔ اے، بی۔ اے کے امتحانات فیروز پور سے پاس کیے۔ قیامِ پاکستان کے بعد آپ کا خاندان ہجرت کر کے پاکستان آ گیا تو آپ نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے اُردو کیا۔

اشفاق احمد بحیثیت پروفیسر، دیال سنگھ کالج لاہور، روم یونیورسٹی اٹلی اور پنجاب یونیورسٹی لاہور میں خدمات انجام دیتے رہے۔ ۱۹۶۷ء میں انھوں نے بحیثیت ڈائریکٹر مرکزی اُردو بورڈ میں فرائضِ منصبی سنبھال لیے اور ادارے کو ترقّی کی راہ پر گامزن کیا۔ انھوں نے علمی و ادبی سطح پر بھر پور زندگی بسر کی۔

اشفاق احمد: بیسویں صدی کے ادبی اُفق پر افسانہ نگار، ڈراما نویس، سفرنامہ نگار، نقاد، فیچر نگار، مترجم، شاعر، فلسفی اور دانشور کی حیثیت سے اُبھرے۔ وہ بنیادی طور پر قصہ گو ادیب اور کہانی نویس تھے۔ اُن کی مختلف النوع تخلیقی جہات میں کہانی کی مختلف اشکال ظہور پذیر ہوئیں۔ اُن کی قصہ گوئی اور جادو بیانی کا مظہر اُن کا مقبول ٹیلی وژن پروگرام "زاویہ" تھا جس میں وہ بصیرت افروز گفت گو کرتے اور نوجوانوں کی فکری راہ نمائی کا فریضہ نبھاتے۔ انھوں نے پچاس کے قریب کتابیں تصنیف کیں جو ان کے سہل، رواں اور بے تکلف اندازِ بیان کی عکاس ہیں۔ ان کا لب و لہجہ منفرد اور شیرینیِ گفتار سے بھر پور ہے۔ انھیں حکومتِ پاکستان کی جانب سے "تمغا برائے حسنِ کارکردگی"، "ستارۂ امتیاز" اور "ہلالِ امتیاز" کے قومی اعزازات سے نوازا گیا۔

اشفاق احمد کی معروف تصانیف میں "ایک محبت سو افسانے"، "سفر مینا"، "اُجلے پھول"، "من چلے کا سودا"، "حیرت کدہ"، "ننگے پاؤں"، "تلقین شاہ (ریڈیو پروگرام)"، "ٹاہلی تھلے"، "اُچے برج لاہور دے"، "توتا کہانی"، "زاویہ" (ٹیلی وژن سیریز)، "کھیل تماشا" اور "سفر در سفر" وغیرہ شامل ہیں۔

سبق:۶

ایک اُستاد عدالت کے کٹہرے میں

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو پاکستانی اور عالمی ثقافت سے متعارف کرانا۔
- طلبہ کی اخلاقی تربیت کرنا، گفت گو اور مکالمہ کو ترویج دینا۔
- طلبہ کو اشفاق احمد اور ان جیسے مشاہیر کی زندگی کے تجربات سے سبق حاصل کرنے کی تربیت کرنا۔
- طلبہ میں اُردو ادب کے مختلف اور منفرد اسالیب بیان سے محظوظ ہونے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- متشابہ الفاظ کی شناخت کرنا اور محاوروں سے جملے بنانا۔
- طلبہ کو تحریک دینا کہ وہ بھی اپنی زندگی کے سبق آموز واقعات بیان کریں۔

جس زمانے میں مَیں روم میں لیکچرر تھا، روم یونیورسٹی میں، مَیں سب سے Youngest پروفیسر تھا۔ یونیورسٹیوں میں چھٹیاں تھیں، گرمیوں کا زمانہ تھا۔ دوپہر کے وقت ریڈیو سٹیشن پر مجھے اُردو براڈ کاسٹنگ کرنی پڑتی تھی۔ روم میں دوپہر کے وقت سب لوگ قیلولہ کرتے تھے۔ چار بجے تک سوتے تھے اور روم کی سڑکیں تقریباً خالی ہوتی تھیں اور کارپوریشن نے یہ انتظام کر رکھا تھا کہ وہ وہاں پر پانی کے حوض لگا کر سڑکیں دھوتے ہیں، اور شام تک سڑکیں ٹھنڈی بھی ہو جاتی ہیں، خوش گوار بھی ہو جاتی ہیں، صاف بھی ہو جاتی ہیں؛ تو وہ سڑکوں کو دھو رہے تھے۔ اِکا دُکا کوئی ٹریفک کی سواری آ جا رہی تھی تو مَیں اپنی گاڑی چلاتا ہوا جا رہا تھا۔ اب دیکھیے انسان کے ساتھ ساتھ ایک دیسی مزاج چلتا ہے، آدمی کہیں بھی چلا جائے، تو مَیں گاڑی چلا رہا تھا۔ مَیں نے دیکھا کہ گول دائرہ ہے، اس کے اوپر سے مَیں چکر کاٹ کے آؤں گا۔ پھر مَیں اپنے گھر کی طرف مڑوں گا تو یہ بڑی بے ہودہ بات ہے۔ بیچ میں سے چلتے ہیں۔ اس وقت کون دیکھتا ہے، دوپہر کا وقت ہے، تو مَیں بیچ میں سے گزرا۔ وہاں ایک سپاہی کھڑا تھا، اس نے مجھے دیکھا، اور اُس نے پروا نہیں کی۔ جانے دیا کہ یہ جا رہا ہے، یہ نوجوان تو کوئی بات نہیں۔ جب مَیں نے دیکھا شیشے میں سے گردن گھما کے، کچھ مجھے تھوڑا سا یاد پڑتا ہے کہ مَیں طنزاً مسکرایا۔ کچھ اپنی فیٹ (Fate) کے اوپر، کچھ اپنی کامیابی کے اوپر۔ مَیں نے خوشی منانے کے لیے ایک مسکراہٹ کا پھول اس کی طرف پھینکا۔ جب اس نے یہ دیکھا کہ اس نے میری یہ عزت کی ہے تو اس نے سیٹی بجا کے روک لیا۔ اب وہاں پر سیٹی بجنا موت کے برابر تھی اور رُکنا بھی۔ مَیں رُکا، وہ آ گیا، اور آ کے کھڑا ہو گیا پہلے سلیوٹ کیا۔ ولایت میں رواج ہے کہ جب بھی آپ کا چالان کرتے ہیں، آپ کو پکڑنا ہوتا ہے تو سب سے پہلے آ کر سلیوٹ مارتے ہیں۔ تو اس نے کھڑے ہو کر سلیوٹ مارا۔ اب مَیں اندر تھر تھر کانپ رہا ہوں۔ شیشہ مَیں نے نیچے کیا تو مجھے کہنے لگا کہ آپ کا لائسنس! تو مَیں نے اس سے کہا مَیں زبان نہیں جانتا۔ اس نے کہا، چنگی بھلی بول رہے ہو۔ مَیں نے کہا، مَیں نہیں جانتا تم ایسے ہی جھوٹ بول رہے ہو۔ مَیں تو نہیں جانتا ہوں۔ اس نے کہا نہیں، آپ اپنا لائسنس دیں۔ تو مَیں نے کہا، فرض کریں جس کے پاس اس کا لائسنس نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے؟ اس نے کہا، کوئی بات نہیں! مَیں آپ کا چالان کر

دیتا ہوں، پرچی پھاڑ کے تو یہ آپ لے جائیں اور جرمانہ جمع کروا دیں۔ مَیں تو ایسے ہی ہانک رہا تھا۔ مَیں نے کہا، مجھ سے غلطی ہوگئی۔ اس نے مسکراتے ہوئے کہا غلطی ہوگئی تھی تو چلے جاتے۔ اس نے بغیر مجھ سے پوچھے کاپی نکالی اور چالان کر دیا۔ اور چالان بھی بڑا سخت، بارہ آنے جرمانہ۔ مَیں نے لے لی پرچی۔ مَیں نے کہا، مَیں اس کو لے کر کیا کروں؟ اس نے کہا اپنے کسی بھی قریبی ڈاک خانے میں منی آرڈر کی کھڑکی پر جمع کروا دیں۔ بس وہاں کچہری نہیں جانا پڑتا، دھکے نہیں کھانے پڑتے۔ بس آپ کا جرمانہ ہوگیا، آپ ڈاک خانے میں دیں گے تو بس۔ مَیں جب چالان کروا کے گھر آ گیا تو مَیں نے اپنی لینڈ لیڈی سے کہا، میرا چالان ہوگیا ہے۔ کہنے لگی، آپ کا؟ مَیں نے کہا، مَیں کیا کروں۔ اب ان کو ایسے لگا کہ ہمارے گھر میں جیسے ایک بڑا مجرم رہتا ہے۔ اور اس نے اپنی بیٹی کو بتایا کہ پروفیسر کا چالان ہوگیا ہے۔ بڈھی مائی تھی۔ اُس کی ایک ساس تھی، اس کو بھی بتایا، سارے روتے ہوئے میرے پاس آ گئے۔ مَیں بڑا ڈرا کہ یا اللہ! یہ کیا۔ کہنے لگے تُو شریف آدمی لگتا تھا۔ اچھے خاندان کا، اچھے گھر کا لگتا تھا۔ ہم نے تجھے یہ کرائے پر کمرہ بھی دیا ہوا ہے لیکن تُو ویسا نہیں نکلا۔ خیر! گھر خالی کرنے کو تو نہیں کہا۔ جو بڈھی مائی تھی، اُس کی ساس، اُس نے کہا، ہو تو گیا ہے برخوردار چالان، لیکن کسی سے ذکر نہ کرنا۔ محلے داری کا معاملہ ہے۔ اگر ان کو پتا چل گیا کہ اس کا چالان ہوگیا ہے تو بڑی رُسوائی ہوگی۔ لوگوں کو پتا چلے گا۔ مَیں نے کہا نہیں، مَیں پتا نہیں لگنے دوں گا۔

میری لااُبالی طبیعت، چھبیس سال کی عمر تھی۔ چالان جیب میں ڈالا اور نکل گیا دوستوں سے ملنے۔ اگلے دن مجھے جمع کروانا تھا، بھُول گیا۔ پھر سارا دن گزر گیا۔ اس سے اگلے دن مجھے اصولاً جمع کروا دینا چاہیے تھا تو مَیں نے کپڑے بدلے تو وہ پرانے کوٹ میں رہ گیا۔

شام کے وقت مجھے ایک تار ملا کہ محترمی جناب پروفیسر صاحب! فلاں فلاں مقام پر فلاں چوراہے پر آپ کا چالان کر دیا گیا تھا، فلاں سپاہی نے۔ یہ نمبر ہے آپ کے چالان کا۔ آپ نے ابھی تک کہیں بھی چالان کے پیسے جمع نہیں کروائے۔ یہ بڑی حکم عدولی ہے۔ مہربانی فرما کر اسے جمع کروا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ تقریباً اکیس روپے کا تار تھا۔ مَیں نے سارے لفظ گنے۔ مجھ سے یہ کوتاہی ہوئی کہ مَیں پھر بھول گیا، اور ان کا پھر ایک اور تار آیا۔ اگر آپ اب بھی رقم جمع نہیں کروائیں گے تو پھر ہمیں افسوس ہے کہ کورٹ میں پیش کر دینا پڑے گا۔ مجھ سے کوتاہی ہوئی، نہیں جاسکا۔ تب مجھے کورٹ سے ایک سمن آگیا کہ فلاں تاریخ کو عدالت میں پیش ہو جائیں، اور یہ جو آپ نے حکم عدولی کی ہے، قانون توڑا ہے، اس کے بارے میں آپ سے پورا انصاف کیا جائے گا۔

اب مَیں ڈرا۔ میری سٹی گم ہوئی۔ پریشان ہوا کہ اب مَیں دیارِ غیر میں ہوں۔ کوئی میرا حامی و ناصر، مددگار نہیں ہے۔ مَیں کس کو اپنا والی بناؤں گا۔ میرا ڈاکٹر تھا۔ ''ڈاکٹر بالدی'' اس کا نام تھا، نوجوان تھا۔ مَیں نے اس سے کہا، مجھے وکیل کر دو۔ اس نے کہا، میرا ایک دوست ہے۔ اس کے پاس چلتے ہیں۔ اس کے پاس گئے۔ اس نے کہا، یہ تھوڑا سا پیچیدہ ہو جائے گا، اگر مَیں گیا عدالت میں۔ بہتر یہی ہے پروفیسر صاحب جائیں، اور جا کر خود Face کریں۔ عدالت کی خدمت میں یہ عرض کریں کہ مَیں چوں کہ اس قانون کو ٹھیک طرح سے نہیں جانتا تھا۔ مَیں یہاں پر ایک غیر ملکی ہوں تو مجھے معافی دی جائے۔ مَیں ایسا آیندہ نہیں کروں گا۔ مَیں نے کہا ٹھیک ہے۔ چناں چہ مَیں ڈرتا ڈرتا چلا گیا۔

اگر آپ کو روم جانے کا اتفاق ہو تو ''پالاس آف دی جسٹی'' Palace of Justice وہ رومن زمانے کا بہت بڑا وسیع و عریض ہے، اُسے تلاش کرتے کرتے ہم اپنے جج صاحب کے کمرے میں پہنچے تو وہ وہاں تشریف فرما تھے۔ مجھے ترتیب کے ساتھ بلایا گیا تو مَیں چلا گیا۔ اب

بالکل میرے بدن میں روح نہیں ہے، اور میں خوف زدہ ہوں، اور کانپنے کی بھی مجھ میں جرأت نہیں۔ اس لیے کہ تشنج جیسی کیفیت ہو گئی تھی۔

انھوں نے حکم دیا، آپ کھڑے ہوں اس کٹہرے کے اندر۔ اب عدالت نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کا چالان ہوا تھا، اور آپ کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ آپ یہ بارہ آنے ڈاک خانے میں جمع کروائیں، کیوں نہیں کروائے؟ مَیں نے کہا، جی مجھ سے کوتاہی ہوئی، مجھے کروانے چاہییں تھے، لیکن مَیں۔۔۔۔ اس نے کہا، کتنا وقت عملے کا ضائع ہوا۔ کتنا پولیس کا ہوا، اب کتنا 'جسٹیک' کا ہوا (جسٹس عدالت کا ہو رہا ہے) اور آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے تھا۔ ہم اس کے بارے میں آپ کو کڑی سزا دیں گے۔

مَیں نے کہا، مَیں یہاں پر ایک فارنر ہوں۔ پردیسی ہوں۔ جیسا ہمارا بہانہ ہوتا ہے، مَیں کچھ زیادہ آداب نہیں سمجھتا۔ قانون سے مَیں واقف نہیں ہوں تو مجھ پر مہربانی فرمائیں۔ انھوں نے کہا، آپ زبان تو ٹھیک ٹھاک بولتے ہیں۔ وضاحت کر رہے ہیں۔ آپ کیا کرتے ہیں، تو مَیں چپ کر کے کھڑا رہا۔ پھر انھوں نے پوچھا کہ عدالت آپ سے پوچھتی ہے کہ آپ کون ہیں اور آپ کا پیشہ کیا ہے؟ مَیں نے کہا، مَیں ایک ٹیچر ہوں، پروفیسر ہوں روم یونیورسٹی میں، تو وہ جج صاحب کرسی کو سائیڈ پر کر کے کھڑا ہو گیا اور اس نے اعلان کیا:

"Teacher in the Court, Teacher in the Court."

جیسے اعلان کیا جاتا ہے، اور وہ سارے اُٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ منشی، تھانے دار، عمل دار، جتنے بھی تھے اور اس نے حکم دیا کہ:

"Chair should be brought for the teacher. A teacher has come to the court."

اب وہ کٹہرا چھوٹا سا، مَیں اس کو پکڑ کر کھڑا ہوں۔ وہ کرسی لے آئے۔ حکم ہوا کہ تُو Teacher ہے، کھڑا نہیں رہ سکتا۔ تو پھر اس نے ایک بانی پڑھنی شروع کی۔ جج نے کہا کہ اے معزز استاد! اے دنیا کو علم عطا کرنے والے استاد! اے محترم ترین انسان! اے محترم انسانیت! آپ نے ہی ہم کو عدالت کا، اور عدل کا حکم دیا ہے، اور آپ ہی نے ہم کو یہ علم پڑھایا ہے، اور آپ ہی کی بدولت ہم اس جگہ پر براجمان ہیں۔ اس لیے ہم آپ کے فرمان کے مطابق مجبور ہیں۔ عدالت نے جو ضابطہ قائم کیا ہے، اس کے تحت آپ کو چیک کریں، باوجود اس کے کہ ہمیں اس بات کی شرمندگی ہے، اور ہم بے حد افسردہ ہیں کہ ہم ایک استاد کو جس سے محترم، اور کوئی نہیں ہوتا، اپنی عدالت میں ٹرائل کر رہے ہیں، اور یہ کسی بھی جج کے لیے انتہائی تکلیف دہ موقع ہے کہ کورٹ میں، کٹہرے میں ایک استادِ مکرم ہو اور اس سے Trial کیا جائے۔

اب مَیں شرمندہ اپنی جگہ پر، یا اللہ! یہ کیا شروع ہو رہا ہے۔ مَیں نے کہا، حضور جو بھی آپ کا قانون ہے، علم یا جیسے کیسے بھی آپ کا ضابطہ ہے، اس کے مطابق کریں، مَیں حاضر ہوں۔ تو انھوں نے کہا، ہم نہایت شرمندگی کے ساتھ، اور نہایت دکھ کے ساتھ اور گہرے الم کے ساتھ آپ کو ڈبل جرمانہ کرتے ہیں۔ ڈیڑھ روپیا ہو گیا۔

اب جب مَیں اُٹھ کے اس کرسی میں سے اس کٹہرے میں سے نکل کر شرمندہ، باہر نکلنے کی کوششیں کر رہا تھا۔ وہ جو جج، اس کا عملہ تھا، اس کے منشی تھے وہ سارے جناب میرے پیچھے پیچھے (A teacher in the court) کہہ جا رہے تھے کہ ہم احترامِ فائقہ کے ساتھ آپ کو رخصت کرتے ہیں۔ مَیں کہوں، میری جان چھوڑیں۔ یہ باہر نکل کر میرے ساتھ کیا کریں گے۔ آگے تک میری موٹر تک مجھے چھوڑ کے آئے۔ جب تک مَیں وہاں سے سٹارٹ نہیں ہو گیا، وہ عملہ وہاں پر ایسے ہی کھڑا تھا۔

اب میں لوٹ کے آیا تو میں سمجھا، یا اللہ! میں بڑا معزز آدمی ہوں، اور محلے والوں کو بھی آ کر بتایا کہ میں ایسے گیا تھا، اور وہاں پر یہ یہ ہوا۔ وہ بھی جناب، اور میری جو لینڈ لیڈی تھی، وہ بھی بڑی خوشی کے ساتھ محلے میں چوڑی ہو کے گھوم رہی تھی کہ دیکھو ہمارا یہ ٹیچر گیا، اور کورٹ نے اتنی عزت کی۔ اس کی عزت افزائی ہوئی تو میں یہ سمجھا کہ اس کے ساتھ ساتھ میری تنخواہ میں بھی اضافہ ہوگا۔

دیسی آدمی جو ہے ناں وہ چاہے ٹیچر بھی ہو، وہ گریڈ کا ضرور سوچے گا۔ کتنی بھی آپ عزت دے دیں، کتنا بھی احترام دے دیں، وہ پھر بھی ضرور سوچے گا کہ مجھے کہیں سے چار پیسے بھی ملیں گے کہ نہیں، میں نے اپنے ریکٹر سے پوچھا، تو اس نے کہا نہیں تنخواہ یہاں پروفیسر کی اتنی ہی ہے جتنی تمھارے پاکستان میں ہے۔ وہ کوئی مالی طور پر اتنے بڑے نہیں ہیں لیکن عزت کے اعتبار سے بہت بڑے ہیں۔ رتبہ ان کا بہت زیادہ ہے، اور کوئی شخص یہاں کوئی بیورو کریٹ ہو، یہاں کوئی جج ہو۔ آپ نے دیکھ ہی لیا ہے۔ یہاں کا تاجر ہو، یہاں کا فیوڈل لارڈ ہو، وہ استاد کے رتبے کے پیچھے اس طرح چلتا ہے، جیسے روم کے دنوں میں غلام اپنے آقا کے پیچھے چلتے تھے۔ مالی طور پر وہ بھی بے چارے ہیں۔ یہی ان کا کمال ہے کہ مالی طور پر کمتر ہیں لیکن رتبے کے اعتبار سے بہت اونچے ہیں جیسے سقراط جو تھا، وہ اپنے کھنڈروں میں، اور فورم میں کھڑا ہو کے ننگے پاؤں بات کرتا تھا لیکن اس کا احترام تھا۔ وہ کوئی امیر آدمی نہیں تھا۔ میرا باس کہا کرتا تھا:

"You have changed your profession for a handful silver."

(زاویہ)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیجیے:

(الف) اشفاق احمد کی کتاب "زاویہ" کن موضوعات پر مشتمل ہے؟

(ب) اشفاق احمد روم میں کون سے فرائض انجام دیتے تھے؟

(ج) روم میں اکثر لوگ دوپہر کا وقت کیسے گزارتے ہیں؟

(د) اشفاق احمد کا چالان کیوں ہوا؟

(ہ) جج نے اشفاق احمد کو بطور استاد کیسے مخاطب کیا؟

(و) اشفاق احمد کا باس کیا کہا کرتا تھا؟ اس جملے کی وضاحت بھی کریں۔

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) سبق کے متن کے مطابق روم کی سڑکیں ٹھنڈی ہو جاتی ہیں:

(الف) بارش سے (ب) دھونے سے (ج) موسم سے (د) سائے سے

(ii) "میں طنزاً مسکرایا، کچھ اپنی فیٹ (Fate) کے اوپر، کچھ اپنی کامیابی کے اوپر۔" جملے میں "فیٹ" سے مراد ہے:

(الف) قسمت (ب) شخصیت (ج) دولت (د) واقفیت

(iii) روم میں چالان کے جرمانے کی رقم جمع کرانے کا عام ذریعہ تھا:

(الف) آن لائن (ب) منی آرڈر (ج) چیک (د) دستی

(iv) متن کے مطابق اس وقت اشفاق احمد کی عمر تھی:

(الف) بائیس سال (ب) چوبیس سال (ج) چھبیس سال (د) اٹھائیس سال

(v) جج کا ''Teacher in the Court'' سُن کر کھڑے ہونے کا سبب تھا:

(الف) احترام (ب) خوف (ج) پریشانی (د) غصہ

۳۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں:

(الف) فرض کریں جس کے پاس اس کا ـــــــ نہ ہو تو پھر وہ کیا کرے۔

(ب) میں نے خوشی منانے کے لیے ایک ـــــــ کا پھول اس کی طرف پھینکا۔

(ج) بس وہاں ـــــــ نہیں جانا پڑتا، دھکے نہیں کھانے پڑتے۔

(د) تقریباً ـــــــ روپے کا تار تھا۔

(ہ) ہم نہایت شرمندگی کے ساتھ، اور نہایت دکھ کے ساتھ آپ کو ـــــــ جرمانہ کرتے ہیں۔

۴۔ اس سبق میں سے انگریزی کے الفاظ تلاش کریں اور اُن کا مفہوم بتائیں۔

۵۔ تکریم اساتذہ کے موضوع پر ایک دوسرے سے گفتگو کریں۔

۶۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں:

ہمیں پرنٹ میڈیا، الیکٹرانک میڈیا اور دیگر ذرائع سے آئے روز بچوں سے بدسلوکی، اُن کے اغوا اور قتل کی خبریں سننے کو ملتی ہیں۔ اس کی روک تھام کے لیے، بہت سے اقدامات اٹھانے کی فوری طور پر ضرورت ہے۔ بچوں کو ہوشیار کرنا ہوگا کہ اگر کوئی اجنبی انھیں کھانے کی کوئی چیز دے تو لے کر نہ کھائیں۔ اگر انھیں کوئی کسی چیز کا لالچ دے کر کوئی غلط حرکت کرے، بہانے سے ورغلائے یا اپنے ساتھ لے جانا چاہے، تو اس کے ساتھ ہرگز نہ جائیں بلکہ شور مچا دیں اور اپنی ہر بات اپنے والدین کو بتائیں۔ بچے اپنے والدین کو بغیر بتائے گھر سے باہر نہ نکلیں۔ اس سلسلے میں والدین اور بچوں کے بڑے بھائی بہنوں کو بھی اپنا کردار ادا کرنا ہوگا۔ ماں اور باپ دونوں کو اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ اپنے بچوں کو سکول میں وقت سے پہلے نہ بھیجیں اور چھٹی کے بعد تنہا نہ چھوڑیں۔ بچوں کے ذرائعِ آمد و رفت کا محفوظ تر انتظام کریں۔ بچوں کے دوستوں پر نظر رکھیں اور بچوں سے یہ بھی کہیں کہ کسی پر اندھا اعتماد نہیں کرنا۔ کوئی بھی شخص چاہے وہ دوست یا رشتے دار ہو یا اُستاد ہی کیوں نہ ہو، اگر آپ کو ضرورت سے زیادہ رعایت یا بلاوجہ فائدہ پہنچانے کی کوشش کرے تو اسے ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھیں۔ بچوں کو اس بات کا بھی اعتماد دیں کہ وہ بچے کی ہر بات غور سے سنیں گے اور اس کی ہر بات کا یقین بھی کریں گے۔ سکول انتظامیہ کی بھرپور ذمہ داری ہے کہ بچوں کے تحفظ کے لیے باقاعدہ اور منظم پروگرام ترتیب دے اور بہر صورت ان کی حفاظت کو یقینی بنایا جائے۔

سوالات:

(i) بچے خود اپنی حفاظت کیسے کریں؟

(ii) بچوں کی حفاظت کے سلسلے میں والدین کی کیا ذمہ داری ہے؟

(iii) آپ کسی بچے کے بڑے بہن بھائی ہیں تو اس کی حفاظت کیسے کریں گے؟

(iv) بچوں کی حفاظت کے لیے سکول انتظامیہ کی کیا ذمہ داری ہے؟

(v) اس اقتباس کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

۷۔ درج ذیل جملوں کی درستی کریں:

(الف) اس جملے کی درنگی کرو۔
(ب) عارف نے دو مَن گیہوں خریدی۔
(ج) علی نے اخبار پڑھ لی ہے۔
(د) آپ کی خیریت نیک مطلوب چاہتا ہوں۔
(ہ) یہ راستہ شارع عام نہیں ہے۔
(و) دونوں بچوں کی قامت میں اٹھارہ بیس کا فرق ہے۔

محاورہ: محاورہ اہلِ زبان ہی کی بول چال سے رواج پاتا ہے۔ محاورہ اپنے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ محاورہ دو یا دو سے زیادہ الفاظ کا مرکب ہوتا ہے۔ مثلاً: نیند حرام ہونا، نو دو گیارہ ہونا، تارے گننا، غم کھانا، غصہ پینا وغیرہ۔

۸۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

اپنا سا منھ لے کر رہ جانا، آسمان سر پر اُٹھانا، ہوش کے ناخن لینا، عقل پر پتھر پڑنا، اوسان خطا ہونا

متشابہ الفاظ:

متشابہ الفاظ سے مراد وہ الفاظ ہیں، جو اپنی صوت یا شکل کے لحاظ سے تو ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہوں لیکن اعراب، املا اور معنی کے لحاظ سے مختلف ہوں۔ متشابہ الفاظ کی درج ذیل صورتیں ہیں:

(الف) وہ الفاظ جن کا املا تو ایک جیسا ہو لیکن اعراب کی تبدیلی کی وجہ سے ان کے معانی میں فرق ہو مثلاً: ذَر، ذُر۔ مَلک، مَلَک۔ شَل، شِل۔
عالَم، عالِم وغیرہ

(ب) وہ الفاظ جن کی آواز تو بظاہر ایک جیسی ہو لیکن ان کا املا اور معانی مختلف ہوں مثلاً: راضی، رازی۔ سفر، صفر۔ علم، اَلم۔
کثرت، کسرت وغیرہ

۹۔ سبقی متن کو غور سے پڑھیں اور متشابہ الفاظ تلاش کر کے ان کی فہرست بنائیں۔

۱۰۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح کریں اور حوالۂ متن بھی درج کریں:

"اب میں ڈرا ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ میں ڈرتا ڈرتا چلا گیا۔"

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- اشفاق احمد کی کتاب "زاویہ" پڑھ کر جو تاثر آپ کے ذہن میں اُبھرے اُس کی روشنی میں اُن کا خاکہ تحریر کریں۔
- "سفر در سفر" کا مطالعہ کریں اور آپس میں اشفاق احمد کے اسلوب اور طرزِ بیان پر تبصرہ کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو آگاہ کریں کہ اردو کا دامن بہت وسیع ہے، اُردو میں انگلش اور دوسری یورپی زبانوں کے ان گنت الفاظ روزمرہ گفت گو میں رواج پا چکے ہیں۔
- طلبہ کو محاورہ اور ضرب المثل کا فرق سمجھائیں۔
- طلبہ کو تختۂ تحریر کی مدد سے سمجھائیں کہ بعض الفاظ میں اعراب کی تبدیلی سے ان کے معنوں میں زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔

برائے اضافی مطالعہ

"ماں خدا کی نعمت ہے اور اس کے پیار کا انداز سب سے الگ اور نرالا ہوتا ہے۔ بچپن میں ایک بار بادوباراں کا سخت طوفان تھا اور جب اس میں بجلی شدت کے ساتھ کڑکی تو میں خوف زدہ ہوگیا۔ ڈر کے مارے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ میری ماں نے میرے اوپر کمبل ڈالا اور مجھے گود میں بٹھا لیا تو محسوس ہوا گویا میں امان میں آگیا ہوں۔ میں نے کہا: "اماں! اتنی بارش کیوں ہو رہی ہے؟"

اس نے کہا: "بیٹا! پودے پیاسے ہیں، اللہ تعالیٰ نے انھیں پانی پلانا ہے اور اس بندوبست کے تحت بارش ہو رہی ہے۔"

میں نے کہا: "ٹھیک ہے، پانی تو پلانا ہے لیکن یہ بجلی کیوں بار بار چمکتی ہے؟ یہ اتنا کیوں کڑکتی ہے؟"

وہ کہنے لگیں: "روشنی کر کے پودوں کو پانی پلایا جائے گا، اندھیرے میں تو کسی کے منھ میں تو کسی کی ناک میں پانی چلا جائے گا، اس لیے بجلی کی کڑک چمک ضروری ہے۔"

مَیں ماں کے سینے کے ساتھ لگ کر سو گیا۔ پھر مجھے پتا نہیں چلا کہ بجلی کس قدر چمکتی رہی یا نہیں۔"

(ماں جی: اشفاق احمد)

رشید احمد صدیقی
(۱۸۹۲ء-۱۹۷۷ء)

رشید احمد صدیقی قصبہ مڑیا ہو، ضلع جون پور، (یو۔پی، انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی اور میٹرک تک تعلیم جون پور کے سکول سے حاصل کی۔ مالی حالات سے مجبور ہو کر ضلع کچہری جون پور میں کلرک بھرتی ہو گئے، ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھی اور ایم اے او کالج، علی گڑھ سے ایم اے فارسی کا امتحان پاس کیا۔ بعد میں طالب علمی کے زمانے سے ہی انشائیہ طرز کے مزاحیہ مضامین لکھنے شروع کیے اور تادمِ آخر لکھتے رہے۔ وہ ۱۹۲۲ء میں شعبہ درس و تدریس سے منسلک ہو گئے اور جب علی گڑھ کالج، یونیورسٹی بن گیا تو ترقی پا کر علی گڑھ یونیورسٹی کے صدر شعبۂ اردو کے منصب تک جا پہنچے۔ اس طرح انھوں نے علمی و ادبی طور پر ایک بھرپور زندگی بسر کی۔ ۱۵۔جنوری ۱۹۷۷ء کو رشید احمد صدیقی کا انتقال ہوا وہ علی گڑھ یونیورسٹی کے قبرستان میں دفن ہوئے۔

رشید احمد صدیقی نے مضمون نگاری، خاکہ نگاری اور خطوط نگاری کے میدان میں بھی شہرت حاصل کی۔ وہ اپنے عہد کے ایک نامور انشا پرداز تھے۔

رشید احمد صدیقی کو علی گڑھ سے خاص اُنس تھا۔ ان کی تحریروں میں علی گڑھ کی یادیں جگہ جگہ بکھری پڑی ہیں اور ان کے مزاج میں شائستگی اور خوش طبعی کے وافر عناصر ملتے ہیں۔ ان کا اسلوب بیان نہایت خوب صورت ہے۔ ان کے طنز و مزاح میں گہرا شعور پایا جاتا ہے۔

ان کی اہم تصانیف میں "طنزیات و مضحکات"، "مضامینِ رشید"، "گنج ہائے گراں مایہ"، "ہم نفسانِ رفتہ"، "ہمارے ذاکر صاحب"، "آشفتہ بیانی میری"، "اُردو غزل" اور "مکاتیب رشید احمد صدیقی" شامل ہیں۔

رشید احمد صدیقی کے علمی، ادبی اعزازات میں پدم شری ایوارڈ کے علاوہ ساہتیہ اکیڈمی ایوارڈ سمیت کئی دیگر ایوارڈ شامل ہیں۔

سبق: ۷

چارپائی

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو صنفِ انشائیہ کے بارے میں بنیادی باتیں بتانا۔
- انشائیہ نگاری کی روایت اور ارتقا کا جائزہ لینا۔
- رشید احمد صدیقی کی ادبی خدمات سے روشناس کرانا۔
- طلبہ کو بتانا کہ ''چارپائی'' میں حقیقت نگاری، ادبی لطافت، رنگِ مزاح اور متنوع کیفیات ایک ساتھ جلوہ گر ہیں۔

چارپائی اور مذہب ہم ہندوستانیوں کا اوڑھنا بچھونا ہے۔ ہم اسی پر پیدا ہوتے ہیں اور یہیں سے مدرسے، آفس، جیل خانے، کونسل، یا آخرت کا راستہ لیتے ہیں۔ چارپائی ہماری گھٹی میں پڑی ہوئی ہے۔ ہم اس پر دوا کھاتے ہیں، دعا اور بھیک بھی مانگتے ہیں۔ کبھی فکرِ سخن کرتے ہیں اور کبھی فکرِ قوم۔ اکثر فاقہ کرنے سے بھی باز نہیں آتے۔ ہم کو چارپائی پر اتنا ہی اعتماد ہے جتنا برطانیہ کو آئی۔ سی۔ ایس پر، شاعر کو قافیہ پر یا طالب علم کو نقل غپاڑے پر۔

چارپائی کی مثال ریاست کے ملازم سے دے سکتے ہیں۔ یہ ہر کام کے لیے ناموزوں ہوتا ہے، اس لیے ہر کام پر لگا دیا جاتا ہے۔ ایک ریاست میں کوئی صاحب ''ولایت پاس'' ہو کر آئے۔ ریاست میں کوئی اسامی نہ تھی جو ان کو دی جاسکتی۔ آدمی سوجھ بوجھ کے تھے، راجا صاحب کے کانوں تک یہ بات پہنچا دی کہ کوئی جگہ نہ ملی تو وہ لاٹ صاحب سے مل کر آئے ہیں۔ راجا صاحب ہی کی جگہ پر اکتفا کریں گے۔ ریاست میں ہلچل مچ گئی۔ اتفاق سے ریاست کے سول سرجن رخصت پر گئے ہوئے تھے، یہ ان کی جگہ پر تعینات کر دیے گئے۔ کچھ دنوں بعد سول سرجن صاحب واپس آئے تو انجینئر صاحب پر فالج گرا۔ ان کی جگہ ان کو دے دی گئی۔ آخری بار یہ خبر سنی گئی کہ وہ ریاست کے ہائی کورٹ کے چیف جسٹس ہو گئے تھے اور اپنے ولی عہد کو ریاست کے ولی عہد کا مصاحب بنا دینے کی فکر میں تھے۔

یہی حالت چارپائی کی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان ملازم صاحب سے کہیں زیادہ کارآمد ہوتی ہے۔ فرض کیجیے آپ بیمار ہیں، سفرِ آخرت کا سامان میسّر ہو یا نہ ہو، اگر چارپائی آپ کے پاس ہے تو دنیا میں آپ کو کسی اور چیز کی حاجت نہیں۔ دوا کی پُڑیا تکیے کے نیچے، جوشاندے کی دیگچی سرہانے رکھی ہوئی، چارپائی کے نیچے میلے کپڑے، بچّوں کے کھلونے، جھاڑو، آش جو، روئی کے پھاہے، کاغذ کے ٹکڑے، مچھّر، بھنگے، گھر یا محلے کے دو ایک بچے، جن میں ایک آدھ زکام خسرے میں مبتلا۔ اچھے ہو گئے تو بیوی نے چارپائی کھڑی کر کے غسل کرا دیا، ورنہ آپ کے دشمن اسی چارپائی پر لبِ گور لائے گئے۔

ہندوستانی گھرانوں میں چارپائی کو ڈرائنگ روم، سونے کا کمرہ، غسل خانہ، قلعہ، خانقاہ، دواخانہ، صندوق، کتاب گھر، شفاخانہ، سب کی

حیثیت، کبھی کبھی بہ یک وقت ورنہ وقت وقت پر حاصل رہتی ہے۔ کوئی مہمان آیا، چارپائی نکالی گئی۔ اس پر ایک نئی دری بچھا دی گئی، جس کے تہ کے نشان ایسے معلوم ہوں گے جیسے کسی چھوٹی سی اراضی کو مینڈوں اور نالیوں سے بہت سے مالکوں میں بانٹ دیا گیا ہے اور مہمان صاحب مع اچکن، ٹوپی، بیگ، بُغچی کے بیٹھ گئے اور تھوڑی دیر کے لیے یہ معلوم کرنا دشوار ہو گیا کہ مہمان بے وقوف ہے یا میزبان بدنصیب! چارپائی ہی پر ان کا منھ ہاتھ دھلوایا اور کھانا کھلایا جائے گا اور اسی چارپائی پر یہ سو رہیں گے۔ سو جانے کے بعد ان پر سے مچھر مکھی اسی طرح اڑائی جائے گی جیسے کوئی پھیری والا اپنے خوانچے پر سے جھاڑن تما مور چھل سے مکھیاں اڑا رہا ہو۔

چارپائی پر سوکھنے کے لیے اناج پھیلایا جائے گا، جس پر تمام دن چڑیاں حملے کرتی، دانے چگتی اور گالیاں سنتی رہیں گی۔ کوئی تقریب ہوئی تو بڑے پیمانے پر چارپائی پر آلو چھیلے جائیں گے۔ ملازمت میں پنشن کے قریب ہوتے ہیں تو جو کچھ رخصت جمع ہوئی رہتی ہے، اس کو لے کر ملازمت سے سبک دوش ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی کال کوٹھری میں داخل کر دیتے ہیں اور اس پر سال بھر کا پیاز کا ذخیرہ جمع کر دیا جاتا ہے۔ ایک دفعہ دیہات کے ایک میزبان نے پیاز ہٹا کر اس خاکسار کو ایسی ہی ایک پنشن یافتہ چارپائی پر اسی کال کوٹھری میں بچھا دیا تھا اور پیاز کو چارپائی کے نیچے اکٹھا کر دیا گیا تھا۔ اس رات کو مجھ پر آسمان کے اتنے ہی طبق روشن ہو گئے تھے، جتنی ساری پیازوں میں چھلکے تھے اور وہ یقیناً چودہ سے زیادہ تھے۔

چارپائی ایک اچھے بکس کا بھی کام دیتی ہے، تکیے کے نیچے ہر قسم کی گولیاں، جن کے استعمال سے آپ کے سوا کوئی واقف نہیں ہوتا، ایک آدھ روپیا، چند دھیلے پیسے، اسٹیشنری، کتابیں، رسالے، جاڑے کے کپڑے، تھوڑا بہت ناشتا، نقش سلیمانی، فہرست دواخانہ، سمن، جعلی دستاویز کے کچھ مسودے، یہ سب چارپائی میں آباد ملیں گے۔ میں ایک ایسے صاحب سے واقف ہوں جو چارپائی پر لیٹے لیٹے ان میں سے ہر ایک کو، اجالا ہو یا اندھیرا، اس صحت کے ساتھ آنکھ بند کر کے نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے، جیسے حکیم نابینا صاحب مرحوم اپنے لمبے چوڑے بکس میں سے ہر مرض کی دوائیں نکال لیتے اور پھر رکھ دیتے۔

حکومت بھی چارپائی ہی پر سے ہوتی ہے۔ خاندان کے کرتا دھرتا چارپائی ہی پر براجمان ہوتے ہیں۔ وہیں سے ہر طرح کے احکام جاری ہوتے رہتے ہیں اور گناہ گار کو سزا بھی وہیں سے دی جاتی ہے۔ آلاتِ سزا میں ہاتھ، پاؤں، زبان کے علاوہ ڈنڈا، جوتا، تاملوٹ بھی ہیں جنھیں اکثر پھینک کر مارتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ توقف کرنے میں غصے کا تاؤ مدھم نہ پڑ جائے اور ان آلات کو مجرم پر استعمال کرنے کے بجائے اپنے اوپر استعمال کرنے کی ضرورت نہ محسوس ہونے لگے۔

چارپائی ہی کھانے کا کمرہ بھی ہوتی ہے۔ باورچی خانے سے کھانا چلا اور اس کے ساتھ پانچ سات چھوٹے بڑے بچے، اتنی ہی مرغیاں، دو ایک کتے، بلّی اور بے شمار مکھیاں آ پہنچیں۔ سب اپنے قرینے سے بیٹھ گئیں۔ صاحبِ خانہ صدرِ دسترخوان ہیں۔ ایک بچہ زیادہ کھانے پر مار کھاتا ہے، دوسرا بدتمیزی سے کھانے پر، تیسرا کم کھانے پر، چوتھا زیادہ کھانے پر اور بقیہ اس پر کہ ان کو مکھیاں کھائے جاتی ہیں۔ دوسری طرف بیوی مکھی اُڑاتی جاتی ہے اور شوہر کی بدزبانی سنتی اور بدتمیزی سہتی جاتی ہے۔ کھانا ختم ہوا۔ شوہر شاعر ہوئے تو ہاتھ دھو کر فکرِ سخن میں چارپائی ہی پر لیٹ گئے۔ کہیں دفتر میں ملازم ہوئے تو اس طرح جان لے کر بھاگے جیسے گھر میں آگ لگی ہے۔ اور کوئی مذہبی آدمی

ہوئے تو اللہ کی یاد میں قیلولہ کرنے لگے، بیوی بچے بدن دبانے اور بددعائیں سننے لگے۔

چارپائی ہندوستان کی آب و ہوا، تمدّن و معاشرت، ضرورت اور ایجاد کا سب سے بھرپور نمونہ ہے۔ ہندوستان اور ہندوستانیوں کے مانند ڈھیلی ڈھالی، شکستہ حال، بے سروسامان لیکن ہندوستانیوں کی طرح غالب اور حکمران کے لیے ہر قسم کا سامانِ راحت فراہم کرنے کے لیے آمادہ۔ کوچ اور صوفے کے دل دادہ اور ڈرائنگ روم کے اسیر اس راحت و عافیت کا کیا اندازہ لگا سکتے ہیں جو چارپائی پر میسّر آتی ہے! شعرا نے انسان کی خوشی اور خوش حالی کے لیے کچھ باتیں منتخب کر لی ہیں، مثلاً: سچے دوست، شرافت، فراغت، اور گوشۂ چمن۔ ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے عیش و فراغت کی فہرست اس سے مختصر ہونی چاہیے۔ میرے نزدیک تو صرف ایک چارپائی ان تمام لوازم کو پورا کر سکتی ہے۔

بانوں کی ٹوٹی ہوئی چارپائی ہے جسے مکا کے کھیت میں بطور مچان باندھ دیا گیا ہے۔ ہر طرف جھومتے لہلہاتے کھیت ہیں۔ بارش نے گرد و پیش کو شگفتہ و شاداب کر دیا ہے، دُور دُور جھیلیں جھمکتی جھلکتی نظر آتی ہیں جن میں طرح طرح کے آبی جانور اپنی اپنی بولیوں سے برسات کی عمل داری اور مزے داری کا اعلان کرتے ہیں۔

مچان پر بیٹھا ہوا کسان کھیت کی رکھوالی کر رہا ہے، اس کے یہاں نہ آرائش ہے نہ آسائش، نہ علم و فضل، نہ دولت و اقتدار لیکن یہ سب چارپائی پر بیٹھے ہوئے اسی کسان کی محنت کا کرشمہ ہیں۔ پھر ایک دن آئے گا جب اس کی پیداوار کو چور، مہاجن یا زمیندار لوٹ لیں گے اور اسی چارپائی پر اس کو سانپ ڈس لے گا اور قصہ پاک ہو جائے گا۔

برسات ہی کا موسم ہے۔ گاؤں میں آموں کا باغ کبھی دھوپ کبھی چھاؤں، کوئل کوکتی ہے، ہوا لہکتی ہے۔ گاؤں کے لڑکے لڑکیاں دھوم مچا رہی ہیں۔ کہیں کوئی پکّا ہوا آم ڈال سے ٹوٹ کر گرتا ہے۔ سب کے سب جھپٹتے ہیں۔ جس کو مل گیا، وہ ہیرو بن گیا جس کو نہ ملا اس پر سب نے ٹھٹھے لگائے۔ یہی لڑکے لڑکیاں جو اس وقت کسی طرح قابلِ التفات نظر نہیں آتیں، کسے معلوم آگے چل کر زمانہ اور زندگی کی کن نیرنگیوں کو اجاگر کریں گے، کتنے فاقے کریں گے، کتنے فاتح بنیں گے، کتنے نام ور اور نیک نام، کتنے گم نام و نافرجام اور یہ خاکسار ایک کھرّی چارپائی پر اس باغ میں آرام فرما رہا ہے۔ چارپائی باغبان کی ہے، باغ کسی اور کا ہے، لڑکے لڑکیاں گاؤں کی ہیں۔ میرے حصّے کا صرف آم ہے۔ ایسے میں جو کچھ دماغ میں نہ آئے تھوڑا ہے یا جو تھوڑا دماغ میں ہے وہ بھی نکل جائے تو کیسا تعجب!

پھر عالمِ تصور میں ایسی کائنات تعمیر کرنے لگتا ہوں جو صرف میرے لیے ہے جو میرے ہی اشارے پر بنتی بگڑتی ہے، دوسروں کو اس کا اسیر دیکھ کر چونک پڑتا ہوں۔ پھر یہ محسوس کر کے کہ میں ان لوگوں سے اور خود زمانہ اور زندگی سے علیحدہ بھی ہوں۔ کچھ دیر کے لیے اونگھنے لگتا ہوں۔ ممکن ہے اونگھنے میں پہلے سے مبتلا ہوں۔

(مضامینِ رشید)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) سبق میں ریاست کے ملازم اور چارپائی میں کون کون سی مشابہت بتائی گئی ہے؟

(ب) متن کے مطابق چارپائی کے نیچے کیا کچھ جمع ہوتا ہے؟

(ج) ''ورنہ آپ کے دشمن اسی چارپائی پر لب گور لائے گئے۔'' اس جملے کی وضاحت کریں۔

(د) مصنف کا ''پنشن یافتہ چارپائی'' سے کس طرح پالا پڑا؟

(ہ) چارپائی پر سے حکومت کیسے ہوتی ہے؟

۲۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں:

(الف) چارپائی پر سوکھنے کے لیے ـــــ پھیلایا جائے گا۔

(ب) چارپائی پنشن کے قریب پہنچتی ہے تو اس کو کسی ـــــ میں داخل کر دیتے ہیں۔

(ج) چارپائی ایک اچھے ـــــ کا بھی کام دیتی ہے۔

(د) صاحبِ خانہ صدر ـــــ ہیں۔

(ہ) اور کوئی مذہبی آدمی ہوئے تو اللہ کی یاد میں ـــــ کرنے لگے۔

انشائیہ: انشائیہ نثری ادب کی وہ صنف ہے جو مضمون سے الگ انداز رکھتی ہے۔ انشائیہ میں انشائیہ نگار آزادانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتا ہے جس میں اس کی شخصیت کا پہلو نظر آتا ہے۔ کسی خاص نتیجہ کے بغیر بات کو ختم کرتا ہے۔ انشائیہ میں دل چسپ بیان، غیر رسمی انداز، خوش گوار حیرت اور نظریے کے تیکھے پن کی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ رشید احمد صدیقی کا زیرِ نظر سبق ''چارپائی'' ایک بہترین انشائیہ ہے۔

۳۔ انٹرنیٹ کے ذریعے سے ڈاکٹر وزیر آغا کا تحریر کردہ کوئی انشائیہ تلاش کر کے اپنے دوستوں کو سنائیں۔

خاکہ: خاکہ کے لغوی معنی ابتدائی نقشہ یا ڈھانچا کے ہیں۔ خاکہ سے مراد کسی شخص کی لفظی تصویر کشی ہے۔ خاکہ کو شخصی مرقع یا شخصیت نگاری بھی کہتے ہیں۔ خاکہ نگار کو خاکے کا موضوع بننے والی شخصیت کے مزاج سے مکمل آگاہی ہونی چاہیے۔ بنیادی طور پر خاکہ اختصار، جامعیت اور دل آویز زبان و بیان کا حامل ہوتا ہے۔

۴۔ اپنے پسندیدہ استادِ محترم کا تعارفی خاکہ تحریر کریں اور اپنے دوستوں کو سنائیں۔

رسیدات: رسید کے معنی وصول کرنا، پہنچنا، رسائی وغیرہ کے ہیں۔ اصطلاحی معنوں میں رسید وہ تحریر ہے جس میں کسی شے کے پہنچنے یا وصول ہونے کا مضمون ہو۔ قانونی لحاظ سے رقم یا سامان وصول کرنے کی باقاعدہ تحریر جس میں وصول کرنے والے اور گواہوں کے دستخط موجود ہوں۔

۵۔ فرض کریں کہ آپ نے کسی سے ساٹھ ہزار روپے قرض لیے ہیں۔ اس حوالے سے ایک رسید لکھیں۔

۶۔ مرکب لفظ کا نصف اوّل کالم "الف" میں جب کہ اس کا نصف دوم کالم "ب" میں موجود ہے، انھیں جوڑیے اور کالم "ج" میں پورا مرکب لفظ لکھیے۔ جیسے: اوڑھنا بچھونا

کالم: الف	کالم: ب	کالم: ج
غُل	دوش	
نا	کوشی	
سبک	خوان	
دستر	غپاڑا	
عیش	موزوں	

۷۔ درج ذیل ضرب الامثال کا مفہوم واضح کریں:

- آم کے آم گٹھلی کے دام
- بوڑھی گھوڑی لال لگام
- چور کی داڑھی میں تنکا
- آنکھ اوجھل پہاڑ اوجھل
- تخم تاثیر صحبت اثر
- تلے تیس اُوپر بیس

۸۔ سبق "چار پائی" کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

۹۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباس کی تشریح کریں اور حوالۂ متن بھی درج کریں:

- "چار پائی ہندوستان کی آب و ہوا۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ان تمام لوازم کو پورا کر سکتی ہے۔"

سرگرمی برائے طلبہ:

- اپنے کسی پسندیدہ انشا پرداز کا تعارف تحریر کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو صنفِ انشائیہ کی مختصر تاریخ سے آگاہ کریں۔
- صنفِ انشائیہ کی نمایاں خصوصیات طلبہ کو بتائیں۔
- اُردو کے چند انشائیہ نگاروں کے نام بتائیں۔

خدیجہ مستور

(۱۹۲۷ء-۱۹۸۲ء)

خدیجہ مستور بریلی کے یوسف زئی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ بریلی کے نزدیک ایک گاؤں کے متوسط پٹھان گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ والد کا نام تہوّر علی خاں تھا اور وہ ملازمت پیشہ تھے لہٰذا مختلف مقامات پر ابتدائی زندگی گزاری۔ ان کی والدہ کا نام انور جہاں تھا جو ایک اچھی شاعرہ اور مضمون نگار تھیں۔ اس طرح انھیں ابتدا ہی سے علمی و ادبی ماحول مُیسّر آیا لیکن نو برس کی تھیں کہ والد وفات پا گئے اور خاندان والوں نے کفالت سے ہاتھ کھینچ لیا لہٰذا معاشی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا اور لکھنؤ میں اپنے نانا کے ہاں قیام کرنا پڑا۔ گھر پر تعلیمی سلسلہ جاری رکھا اور اپنی محنت اور ذوق سے وسیع مطالعہ کرنے اور معاشرتی و معاشی حقائق کا ادراک حاصل کرنے میں کامیاب ہوئیں۔

خدیجہ مستور کی چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور (۱۹۳۰-۲۰۱۲ء) بھی معروف ناول نگار اور افسانہ نگار گزری ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد دونوں بہنیں اپنے گھرانے کے ساتھ پہلے کراچی اور پھر لاہور آ گئیں۔

خدیجہ مستور کو ابتدا ہی سے افسانوی ادب سے فطری لگاؤ تھا۔ ۱۹۴۲ء میں لکھنا شروع کیا اور افسانوں کا پہلا مجموعہ "کھیل" ۱۹۴۴ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد "بوچھار" (۱۹۴۶ء)، "چند روز اور" (۱۹۵۱ء)، "تھکے ہارے" (۱۹۶۲ء) اور ناول "آنگن" (۱۹۶۲ء) بھی شائع ہوئے۔ "آنگن" پر ان کو آدم جی ادبی انعام ملا۔ ان کی آخری تصنیف "زمین" ان کی وفات کے بعد ۱۹۸۷ء میں شائع ہوئی۔

خدیجہ مستور اُردو خواتین ناول نگاروں میں اس لحاظ سے اہم ہیں کہ انھوں نے اپنے ناول "آنگن" میں سماجی حقیقت نگاری سے کام لیتے ہوئے ایک پورے عہد اور دَور کی کش مکش کو پیش کیا ہے۔ اس لحاظ سے اس ناول کو قیامِ پاکستان کے پس منظر میں لکھے جانے والے ناولوں میں امتیاز حاصل ہے۔ ناول "آنگن" کی کہانی اگرچہ ایک خاندان کی کہانی ہے لیکن اس کہانی کے آئینے میں اُنھوں نے گھریلو زندگی کے تصادم اور کش مکش کے ساتھ ساتھ اپنے عہد کے سیاسی نظریات کے ٹکراؤ، سماجی رجحانات اور معاشی تحریکوں کو بھی پیش کیا ہے۔ ان کا ایک خاص کارنامہ اپنے نسوانی کرداروں کی حقیقی تصویر کشی اور ان کی نفسیات کا سچا اظہار ہے۔

"آنگن" کی زبان نہایت شستہ، رواں اور روزمرہ کی زبان ہے۔ خدیجہ مستور کا اسلوب جدید دور کے سادہ، بے تکلف اور عام فہم انداز کا آئینہ دار ہے جو ناول کے موضوع، کرداروں اور ان کے تمام احساسات و معاملات کے اظہار پر قادر ہے۔ "آنگن" در حقیقت قیامِ پاکستان کے وقت کے ایک متوسط مسلمان گھرانے کی تصویر کشی پر مبنی ہے۔

سبق: ۸

اور پاکستان بن گیا

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کی لسانی اور ادبی مہارتوں کو بہتر بنانا۔
- طلبہ کو فنِ ناول نگاری اور اس کے لوازم سے روشناس کرنا۔
- خدیجہ مستور کے ناول ''آنگن'' کے توسط سے تحریکِ پاکستان کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالنا۔
- طلبہ میں ناول کے کرداروں، واقعات، پلاٹ، مکالمات اور منظر کشی وغیرہ کا تجزیہ کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔

[تعارف: آدم جی ادبی انعام یافتہ ناول ''آنگن'' قیامِ پاکستان کے بعد لکھے جانے والے ناولوں میں ممتاز مقام کا حامل ہے۔ ''آنگن'' میں ہندوستان کے ایک مسلمان گھرانے کی زندگی کے حالات بیان ہوئے ہیں اور اس امر کا تجزیہ کیا گیا ہے کہ افراد کی زندگیوں پر گرد و پیش میں رونما ہونے والے سماجی اور سیاسی واقعات کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ناول میں مسلمان اشراف گھرانوں میں گھریلو زندگی کی جھلک، طبقۂ نسواں کی جذباتی زندگی اور دوسرے کرداروں کی نفسیات کو مہارت سے پیش کیا گیا ہے۔ ناول کا موضوع تقسیم سے ذرا پہلے اور قیامِ پاکستان کے بعد کا وہ مختصر زمانہ ہے جب جنوبی ایشیا کے مسلمان ہجرت کرنے یا نہ کرنے کی کش مکش میں مبتلا تھے اور ملک کے طول و عرض میں جا بجا انسانی خون ارزاں ہو گیا تھا۔]

پاکستان بن گیا۔ لیگی راہ نما کراچی[1] دارالحکومت جا چکے تھے۔ پنجاب میں خون کی ہولی کھیلی جا رہی تھی۔ بڑے چچا اس صدمے سے جیسے نڈھال ہو گئے تھے۔ بیٹھک میں بیماروں کی طرح وہ ہر ایک سے پوچھتے رہتے: ''یہ کیا ہو رہا ہے؟ یہ کیا ہو گیا؟ یہ ہندو مسلمان ایک دم ایک دوسرے کے ایسے جانی دشمن کیسے ہو گئے؟ یہ انھیں کس نے سکھایا ہے؟ ان کے دل سے کس نے محبت چھین لی؟''

جب وہ یہ سب کچھ عالیہ سے پوچھتے تو وہ ان کا سر سہلانے لگتی۔ ''بڑے چچا آپ آرام کیجیے، آپ تھک گئے ہیں بڑے چچا۔'' اور بڑے چچا اس طرح آنکھیں بند کر لیتے جیسے خون کی ندی ان کی آنکھوں کے سامنے بہ رہی ہو۔

''زمانے زمانے کی بات ہے، وہ بھی زمانہ تھا جب ہندو اپنے گاؤں کے مسلمانوں پر آنچ آتے دیکھتے تو سر دھڑ کی بازی لگا دیتے اور مسلمان ہندو کی عزت بچانے کے لیے اپنی جان نچھاور کر دیتا، ایسا بھائی چارہ تھا کہ لگتا ایک ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے ہیں، پر اب کیا رہ گیا، دونوں کے ہاتھوں میں خنجر آ گیا ہے۔'' کریمن بوا فساد کی خبریں سن سن کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتیں۔ اپنے شہر میں فساد تو نہ ہوا تھا مگر سب کی جانوں پر بنی رہتی، پتا نہیں کب کیا ہو جائے۔

(۱) قیامِ پاکستان کے بعد کراچی کو پاکستان کا دارالحکومت منتخب کیا گیا تھا۔ بعد میں ۱۴/ اگست ۱۹۶۷ء کو کراچی سے اسلام آباد منتقل ہوا۔

"کہاں ہوگا میرا شکیل؟" بمبئی[1] میں فساد کی خبر سن کر بڑی چچی بلکنے لگیں۔
"تمھارا پاکستان بن گیا جمیل! تمھارے ابا کا ملک بھی آزاد ہوگیا، پر میرے شکیل کو اب کون لائے گا؟"
"سب ٹھیک ہوجائے گا اماں، وہ خیریت سے ہوگا۔ یہ فساد دو سادو تو چار دن میں ختم ہوجائیں گے۔" جمیل بھیا ان کو سمجھاتے مگر ان کا چہرہ فق رہتا۔
شام سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ماموں کا خط آگیا۔ انھوں نے اماں کو لکھا تھا کہ انھوں نے اپنی خدمات پاکستان کے لیے وقف کردی ہیں اور وہ جلد ہی جارہے ہیں۔ اگر آپ لوگوں کو چلنا ہو تو فوراً جواب دیجیے اور تیار رہیے۔
"بس ابھی تار دے دو جمیل میاں، ہماری تیاری میں کیا لگے گا ہم تو بس تیار بیٹھے ہیں۔ اپنا بھائی ہے بھلا ہمیں اکیلا چھوڑ کر جاسکتا ہے؟" مارے خوشی کے اماں کا منھ سرخ ہو رہا تھا۔
جمیل بھیا نے اس طرح گھبرا کر سب کی طرف دیکھا جیسے فسادی ان کے دروازے پر پہنچ گئے ہوں: "مگر آپ کیوں جائیں گی چھوٹی چچی؟ آپ یہاں محفوظ ہیں۔ میں آپ کے لیے اپنی جان دے دوں گا۔" انھوں نے آج بڑی مدت بعد عالیہ کی طرف دیکھا، کیسی سفارشی نظریں تھیں مگر عالیہ نے اپنی آنکھیں جھکالیں۔
"میں نہ جاؤں تو کیا ہندوؤں کے نگر میں رہوں، پاکستان میں اپنوں کی تو حکومت ہوگی، پھر میں اپنے بھائی کو چھوڑ کر ایک منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتی، واہ۔"
مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جارہا تھا۔
"عالیہ جانے پر راضی نہیں ہوگی چھوٹی چچی، وہ نہیں جائے گی، وہ جا ہی نہیں سکتی۔" جمیل بھیا نے جیسے نیم دیوانگی کے عالم میں کہا:
"تم اچھے حق دار آگئے، کون نہیں جائے گا؟" اماں ایک دم بپھر اٹھیں۔ "تم ہوتے کون ہو روکنے والے؟"
"ضرور جایئے چھوٹی چچی۔" جمیل بھیا نے سر جھکا دیا اور عالیہ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جاسکتی۔ صدیاں گزر جائیں گی مگر وہ یہاں سے مل بھی نہ سکے گی۔
"میں ابھی تار کیے دیتا ہوں کہ سب تیار ہیں۔" جمیل بھیا اٹھ کر باہر چلے گئے۔
عالیہ کا جی چاہا کہ وہ چیخ چیخ کر اعلان کرے کہ وہ نہیں جائے گی، وہ نہیں جاسکتی، اسے کوئی نہیں لے جاسکتا مگر اس کے گلے میں تو سیکڑوں کانٹے چُبھ رہے تھے، وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی، اس نے ہر طرف دیکھا اور پھر نظریں جھکالیں مگر وہ کیوں رکے، کس لیے، کس کے لیے، اس نے سوچا اور پھر جیسے بڑے سکون سے چھالیہ کاٹنے لگی۔ عالیہ بیگم اگر تم رہ گئیں تو ہمیشہ کے لیے دلدل میں پھنس جاؤ گی۔
"کریمن بوا اگر سب لوگ چائے پی چکے ہوں تو۔۔۔۔" اسرار میاں نے بیٹھک سے آواز لگائی اور کریمن بوا آج تو ڈائنوں کی طرح چیخنے لگیں: "ارے کوئی تو اس اسرار میاں کو بھی پاکستان بھیج دو۔ سب چلے گئے سب چلے جائیں گے مگر یہ کہیں نہیں جاتا۔"
بیٹھک میں اسرار میاں کے کھانسنے کی آواز آئی اور پھر خاموشی چھا گئی۔

(۱) موجودہ ممبئی

''کیا تم سچ مچ چلی جاؤ گی چھوٹی دلھن؟'' بڑی دیر تک چپ رہنے کے بعد بڑی چچی نے پوچھا۔

''ظاہر ہے کہ چلی جاؤں گی۔'' اماں نے رُکھائی سے جواب دیا۔

''یہ گھر تمھارا ہے چھوٹی دلھن، مجھے اکیلے نہ چھوڑو۔'' بڑی چچی نے ڈبڈبائی ہوئی آنکھیں بند کرلیں، شاید وہ تنہائی کے بھوت سے ڈر رہی تھیں۔

عالیہ جیسے پناہ ڈھونڈنے کے لیے اوپر بھاگ گئی۔ دھوپ پھیکی پڑ کر سامنے کے مکان کی اونچی دیوار پر چڑھ گئی تھی۔ ہائی اسکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے پرند مسلسل شور مچائے جا رہے تھے۔

کھلی فضا میں آکر اس نے اطمینان کی سانس لی اور مسافروں کی طرح ٹہل ٹہل کر سوچنے لگی کہ اب آگے کیا ہوگا، شاید اچھا ہی ہو، وہ یہاں سے جا کر ضرور خوش رہے گی۔

جب وہ نیچے اتری تو سب اپنے اپنے خیالوں میں مگن بیٹھے تھے، صرف کریمن بوا جانے کس بات پر بڑبڑا رہی تھیں اور پھرتی سے روٹیاں پکاتی جا رہی تھیں۔

جمیل بھیا کہاں گئے، اب تک کیوں نہیں آئے، عالیہ نے صوفی کرسی کی طرف دیکھا۔ جانے یہ سرپھرا آدمی اسے یاد کرے گا یا بھول جائے گا۔ اس نے اپنے آپ سے پوچھا۔

لالٹین کی بتی خراب تھی اس لیے اس میں سے دو لویں اُٹھ رہی تھیں اور ایک طرف سے چمنی سیاہ ہوگئی تھی۔ مدھم روشنی میں بڑی چچی اور کریمن بوا کے چہرے بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

جمیل بھیا گھر میں داخل ہوئے اور اپنی کرسی پر بیٹھ گئے۔ ''میں تار کر آیا ہوں چھوٹی چچی!'' انھوں نے دھیرے سے کہا۔

''تم اتنی دیر تک باہر نہ رہا کرو، شام سے گھر آجایا کرو، جانے کب یہاں بھی گڑبڑ ہو جائے۔'' بڑی چچی نے کہا۔

''رہنا تو پڑتا ہے، مسلمان ڈرے ہوئے ہیں، انھیں سمجھانا ہے کہ وہ یہاں، ڈٹ کر رہیں اور یہاں کی فضا کو پرامن رکھیں، گھر میں بیٹھ کر تو کام نہ چلے گا۔''

''تو اب ملک آزاد ہوگیا تو یہ کام شروع ہو گئے، خیر مجھے کیا تم نے تار پر پتا ٹھیک لکھا تھا ناں؟'' اماں نے پوچھا۔

''آپ اطمینان رکھیں، پتا ٹھیک تھا۔''

''خیر سے ہم تو پاکستان جا رہے ہیں، مگر اب تم اپنے گھر کی فکر کرو جمیل میاں، کیا بُری حالت ہو چکی ہے، اپنی ماں کی طرف بھی دیکھو۔'' اماں نے ہمدردی سے بڑی چچی کی طرف دیکھا۔

''کون جا رہا ہے پاکستان؟'' بڑے چچا نے صحن میں قدم رکھتے ہی بوکھلا کر پوچھا۔ انھوں نے اماں کی باتیں سن لی تھیں۔

''میں اور عالیہ جائیں گے، اور کسے جانا ہے۔'' اماں نے تڑاق سے جواب دیا۔

''کوئی نہیں جا سکتا، میری اجازت کے بغیر، کوئی قدم نہیں نکال سکتا، کس لیے جاؤ گے پاکستان؟ یہ ہمارا ملک ہے، ہم نے قربانیاں دی ہیں اور اب ہم اسے چھوڑ کر چلے جائیں؟ اب تو ہمارے عیش کرنے کا وقت آ رہا ہے۔'' بڑے چچا سخت جوش میں تھے۔

''ماشاءاللہ! آپ بڑے حق دار بن کر آ گئے، نہ کھلانے کے نہ پلانے کے، کون سا دکھ تھا جو یہاں آ کر نہیں جھیلا، میرے شوہر کو بھی آپ ہی نے چھین لیا، آپ ہی نے انھیں مار ڈالا۔ میری لڑکی کو یتیم کر دیا اور اب حق جتا رہے ہیں؟'' مارے غصے کے اماں کی آواز کانپ رہی تھی۔

''کریمن بوا میرا کھانا بیٹھک میں بھجوا دو۔'' بڑے چچا سر جھکا کر بیٹھک میں چلے گئے۔

''کیا آپ چلنے سے پہلے بڑے چچا کو بھی بدلہ دینا چاہتی ہیں؟ بڑے چچا نے کسی کو تباہ نہیں کیا، بڑے چچا نے کسی کو دعوت نہیں دی تھی کہ آؤ اور میرا ساتھ دو۔ آپ آج اچھی طرح سن لیں کہ مجھے بڑے چچا سے اتنی ہی محبت ہے جتنی ابا سے تھی۔'' عالیہ نے کھانا چھوڑ دیا اور ہاتھ دھو کر بیٹھک میں چلی گئی، اماں کیا کہتی رہ گئیں اس نے ذرا بھی نہ سنا۔

''کیا تم سچ مچ جا رہی ہو بیٹی؟''

''ہاں بڑے چچا، اماں جو تیار ہیں۔'' اس نے بے بسی سے جواب دیا۔

''یہ انگریز جاتے جاتے بھی چال چل گیا، لوگوں کو گھر سے بے گھر کر گیا، پھر بھی تم مت جاؤ بیٹی! اپنی ماں کو سمجھا لو، اب تمھارے سکھ کا زمانہ آ گیا ہے۔''

''بڑے چچا میں تو اماں کا واحد سہارا ہوں، میں انھیں کس طرح چھوڑ دوں، وہ ضرور جائیں گی مگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ گھر چھوڑ کر میں کس طرح تڑپوں گی، آپ ۔۔۔ آپ تو ۔۔۔'' وہ دونوں ہاتھوں میں منھ چھپا کر سسکنے لگی۔

''چھوٹی دلھن کو مجھ سے سخت نفرت ہے، ٹھیک ہے، میں نے تم لوگوں کے لیے کچھ بھی نہ کیا، مگر اب وقت آیا تھا کہ اس گھر میں پہلی سی شادمانی لوٹ آتی، مجھے بڑی اچھی ملازمت دی جا رہی ہے، پھر دکانوں کو چلانے کے لیے دس پندرہ ہزار کی امداد بھی ملنے کی توقع ہے، میں چھوٹی دلھن کی سب شکایتیں رفع کر دوں گا۔'' انھوں نے عالیہ کو پیار سے تھپکا۔۔۔ ''کیا گھر میں تیل ختم ہو گیا ہے؟ لالٹین کی روشنی مدھم ہوتی جا رہی ہے، اب ان شاءاللہ تھوڑے دنوں میں بجلی کا کنکشن بحال کرا لوں گا اور اب تم ایم۔ اے میں داخلہ کیوں نہ لے لو میرا خیال ہے کہ تم کو اگلے سال ضرور داخل کرا دوں۔''

عالیہ کا کلیجہ کٹ رہا تھا۔ آنسو پونچھ کر وہ خاموش بیٹھی رہی۔ جی ہی جی میں گھٹ رہی تھی مگر ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ خدا آپ کو سکھ دے بڑے چچا، خدا آپ کے سارے سہانے خواب پورے کرے۔ وہ دل ہی دل میں دعا مانگ رہی تھی۔ وہ بڑے چچا سے کس طرح کہتی کہ وہ تو یہاں سے خود بھاگ جانا چاہتی ہے۔

اسرار میاں بیٹھک میں داخل ہونے کے لیے پٹ کھول رہے تھے۔ عالیہ اٹھ کر صحن میں آ گئی۔

اماں اور بڑی چچی جانے کیا باتیں کر رہی تھیں۔ جمیل بھیا اب تک کرسی پر بیٹھے انگلیاں مروڑ رہے تھے۔ وہ ایک لمحے تک آنگن میں کھڑی رہی اور پھر اوپر چلی گئی۔

شبنم سے بھیگی ہوئی رات بڑی روشن ہو رہی تھی۔ چاند جیسے وسط آسمان پر چمک رہا تھا اور روز کی طرح آج بھی قریب کی کسی چھت پر گراموفون ریکارڈ بج رہے تھے:

''تیری گٹھڑی میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا''

وہ آہستہ آہستہ ٹہلنے لگی کیسی عجیب سی حالت ہو رہی تھی، جیسے سوچنے سمجھنے کی ساری صلاحیت کسی نے چھین لی ہو۔ کیا یہ میں ہوں؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا اور پھر اپنی آواز سن کر حیران رہ گئی۔ حد ہے دیوانگی کی وہ کس سے پوچھ رہی تھی۔

ٹہلتے ٹہلتے وہ ایک بار مڑی تو جمیل بھیا بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے تھے۔ وہ اور تیزی سے ٹہلنے لگی۔ اب یہ کیا کہنے آئے ہیں۔ انھوں نے اپنا وعدہ بھلا دیا۔

''کیا سچ مچ تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے؟'' انھوں نے دھیرے سے پوچھا۔ ''ہاں!'' اس نے ٹہلتے ہوئے جواب دیا۔

''تم یہاں سے جا کر غلطی کرو گی۔ تم نے ایک بار کہا تھا ناں کہ دُور رہ کر یادیں بہت اذیت ناک ہو جاتی ہیں۔ میرا خیال ہے کہ تم وہاں خوش نہ رہو گی۔''

''میں ہر جگہ خوش رہوں گی۔ مگر آپ نے تو وعدہ کیا تھا کہ آپ مجھ سے کبھی کچھ نہ کہیں گے۔''

''میں کیا کہہ رہا ہوں؟''

''کچھ نہیں۔''

''تم میری مقروض ہو، یاد رکھنا کہ تم کو یہ قرض چکانا ہوگا۔'' وہ جانے کے لیے مڑے۔ ''تم وہاں خوش رہو گی ناں؟'' انھوں نے رک کر پوچھا۔

وہ چپ رہی۔ جمیل بھیا تھوڑی دیر کھڑے رہے اور پھر چلے گئے اور اس نے محسوس کیا کہ اس وقت وہ سب کچھ کھو بیٹھی ہے۔

بڑی دیر تک یوں ہی ٹہلنے کے بعد جب وہ تھک گئی تو چھمی کو خط لکھنے بیٹھ گئی، اسے یہاں سے جانے کی اطلاع دینی تھی۔

(آنگن)

مشق

ا۔ مختصر جواب دیں:

(الف) ناول ''آنگن'' کس تناظر میں لکھا گیا ہے؟

(ب) بڑے چچا کس صدمے سے نڈھال تھے اور اُن کی کیا حالت تھی؟

(ج) ''مارے خوشی کے اماں سے نچلا نہ بیٹھا جا رہا تھا۔'' اس جملے میں ''نچلا نہ بیٹھا جا رہا تھا'' کا کیا مطلب ہے؟

(د) عالیہ کی امّاں نے بڑے چچا کو کون سے سخت الفاظ کہے؟

(ہ) عالیہ نے بڑے چچا کی محبت میں کیا الفاظ ادا کیے؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) سبق "اور پاکستان بن گیا" خدیجہ مستور کی تصنیف سے ماخوذ ہے:

(الف) کھیل (ب) بوچھار (ج) چند روز اور (د) آنگن

(ii) "آنگن" نثری اصنافِ ادب کے لحاظ سے ہے:

(الف) ناول (ب) ڈراما (ج) داستان (د) افسانہ

(iii) سبق "اور پاکستان بن گیا" کا مرکزی نسوانی کردار ہے:

(الف) عالیہ (ب) کریمن بوا (ج) عالیہ کی ماں (د) جمیل کی ماں

(iv) متن کے مطابق جمیل بھیا نے تار کسے بھیجا؟

(الف) ماموں کو (ب) چچا کو (ج) دوست کو (د) چچی کو

(v) ہائی سکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے پرند مسلسل:

(الف) بول رہے تھے (ب) شور مچائے جا رہے تھے (ج) خاموش تھے (د) اُڑ رہے تھے

(vi) "تیری گٹھڑی میں لاگا چور، مسافر جاگ ذرا" اس گیت کی آواز کہاں سے آرہی تھی؟

(الف) ریڈیو سے (ب) ٹیپ ریکارڈ سے (ج) گراموفون سے (د) ٹیلی وژن سے

۳۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پُر کریں:

(الف) سب لوگ خاموش بیٹھے چائے پی رہے تھے کہ ـــــ کا خط آ گیا۔

(ب) جمیل بھیا نے سر جھکا دیا اور ـــــ کو ایسا محسوس ہوا کہ وہ نہیں جاسکتی۔

(ج) کریمن بوا آج تو ـــــ کی طرح چیخنے لگیں۔

(د) ہائی سکول کے احاطے میں بسیرا لینے والے ـــــ مسلسل شور مچائے جا رہے تھے۔

(ہ) مدھم روشنی میں ایک بڑی چچی اور کریمن بوا کے ـــــ بگڑے بگڑے لگ رہے تھے۔

۴۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں:

انسانی معاشرے کا ایک اہم گوشہ حقوقِ نسواں کا ہے۔ اسلام نے حقوقِ نسواں واضح طور پر متعین فرما کر ان کی فراہمی اور استفادے کو بھی یقینی بنایا ہے۔ پوری دنیا میں اسلام کے علاوہ کوئی دوسری تہذیب نظر نہیں آتی جس نے مکمل طور پر عورت کے حقوق کی پاس داری کی ہو۔ اسلام نے خواتین کے حقوق و فرائض کا تعین کرتے ہوئے ان کے فرائض کی جہتوں کا تعین کر دیا ہے۔ ان کے فرائض ان کی بساط کے مطابق رکھے ہیں اور ان کی عزت و عظمت کی حفاظت اور پاس داری کا خصوصی اہتمام کیا ہے۔ اسلام نے خواتین کو کسبِ معاش اور بچوں کی کفالت کی ذمہ داری سے مکمل طور پر آزاد کر کے متعلقہ مرد حضرات کو اس کا ذمہ دار قرار دیا ہے۔ عورت شادی سے قبل والد کی اور نکاح کے بعد شوہر کی کفالت میں آجاتی ہے۔ اس کی تمام تر بنیادی ضروریات کی فراہمی ان مردوں پر لازم قرار دی گئی ہے۔ عورت کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ

آزادی سے عمومی تعلیم یا پیشہ ورانہ تعلیم وتربیت حاصل کرے۔ اسلام خواتین کے بنیادی حقوق کی فراہمی یقینی بناتا ہے اوران کی کفالت مرد حضرات پر عائد کرتا ہے۔ دینِ اسلام عورت کے اس مالی حق کی حفاظت کرتے ہوئے ان کو وراثت کا باقاعدہ حصہ دار بناتا ہے۔

سوالات:

- ''حقوقِ نسواں'' کے لغوی معنی کیا ہیں؟
- اسلام نے خواتین کو کن ذمہ داریوں سے آزاد کیا ہے؟
- بنیادی انسانی حقوق کی نشان دہی کریں۔
- اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

ترکیب کے لحاظ سے جملے کے اجزا:

الفاظ کا مجموعہ کلام، مرکب تام یا جملہ کہلاتا ہے۔ جملہ دو قسم کا ہوتا ہے ایک بے معنی اور دوسرا بامعنی۔ بامعنی جملے کو جملہ تام کہتے ہیں مثلاً: سیب میٹھا ہے۔ جملہ تام کے دو حصے ہوتے ہیں: وہ حصہ جس میں کسی شخص یا چیز کا ذکر ہو اسے مُسند الیہ اور جس شخص یا چیز کے بارے میں کچھ کہا جائے اسے مُسند کہتے ہیں۔ اوپر کے جملے میں ''سیب'' مسند الیہ اور ''میٹھا ہے'' مُسند ہے۔ جملے میں مُسند الیہ ہمیشہ اسم ہوتا ہے جبکہ مسند کبھی اسم ہوتا ہے اور کبھی فعل۔

جملے کی اقسام: جملے کی دو اہم اقسام درج ذیل ہیں: **(الف) جملہ اسمیہ** **(ب) جملہ فعلیہ**

(الف) جملہ اسمیہ: ایسا جملہ جس میں مُسند الیہ اور مُسند دونوں اسم ہوں اور آخر میں فعلِ ناقص آئے مثلاً: ارشد عقل مند ہے۔

(ب) جملہ فعلیہ: ایسا جملہ جس میں مُسند الیہ اسم ہو اور مُسند فعل ہو، مثلاً: لڑکا کھیلتا ہے۔

جملہ فعلیہ کے تین بڑے اجزا فاعل، مفعول اور فعلِ تام ہوتے ہیں۔ مسند الیہ کو فاعل، مُسند کو مفعول اور آخر میں آنے والے فعل کو فعلِ تام کہتے ہیں۔

۵۔ درج ذیل جملوں میں سے مسند الیہ اور مسند علیحدہ علیحدہ کریں:

- جانور صحت مند ہے۔
- ارسلان نماز پڑھتا ہے۔
- طلبہ سکول گئے۔
- وہ صبح سویرے اٹھ جاتا ہے۔

۶۔ اس سبق میں سے پانچ جملہ اسمیہ اور پانچ جملہ فعلیہ تلاش کرکے کاپی میں لکھیں۔

ضرب المثل: ضرب کے معنی ہیں بیان کرنا اور مثل کے معنی ہیں مثال۔ ضرب المثل کے معنی ہوئے مثال دے کر بیان کرنا۔ ضرب المثل کو اُردو میں کہاوت بھی کہتے ہیں۔ اس سے مراد ایسا جملہ ہے جو مثال کے طور پر پیش کیا جائے۔ اس جملے میں جو بات کہی جائے اسے عالم گیر سچائی (Universal Truth) کا درجہ دیا جاتا ہے۔ ضرب الامثال یا کہاوتیں صدیوں کے تجربات اور انسانی زندگی کے لاتعداد مشاہدات کے جواہر پارے ہوتے ہیں اور انھیں علم وحکمت کا نچوڑ سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً: آپ کاج مہا کاج، آ بیل مجھے مار، آج کا کام کل پر نہ چھوڑو، وغیرہ

۷۔ درج ذیل ضرب الامثال کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

آج مرا کل دوسرا دن	تن کنگال تو من کنگال	ترے گا سو ڈوبے گا
بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی	اپنا اپنا غیر غیر	دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ گھاٹ کا

۸۔ درج ذیل الفاظ پر دُرست اعراب لگائیں:

دارالحکومت ڈبڈبانا بسیرا کلیجہ امن مروت تیوری

- درخواست نویسی:

اصطلاحاً درخواست وہ تحریر ہے جو کسی ماتحت یا عام آدمی کی طرف سے کسی مسئلے یا شکایت کے حل کے لیے متعلقہ افسر کے نام لکھی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر کسی طالب علم کی اپنے ادارے کے پرنسپل کے نام درخواست لکھنا۔ درخواست مجوزہ طریقِ کار کے مطابق لکھی جاتی ہے۔

درخواست کے حصّے:

(الف) تخاطب (ب) موضوع (ج) آداب (د) نفسِ مضمون (ہ) اختتامیہ اور تاریخ

۹۔ اپنے محلے میں مناسب روشنی کے انتظام کے لیے میونسپل ایڈمنسٹریٹر کے نام درخواست لکھیے۔

۱۰۔ سبق "اور پاکستان بن گیا" کا خلاصہ تحریر کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- طلبہ اپنے استادِ محترم سے قیامِ پاکستان کے وقت ہجرت کے حالات کے بارے میں گفت گو کریں۔
- دوسرے علاقوں سے آنے والے طلبہ اپنے ساتھیوں کو بتائیں کہ اپنا گھر بار چھوڑ کے آنا کس قدر مشکل ہے۔ اپنے علاقے سے جذباتی لگاؤ کتنی بے قراری پیدا کرتا ہے۔ اسی تصور کو ذہن میں رکھتے ہوئے ایک دوسرے سے بات چیت کریں اور اس موضوع پر بحث کریں کہ قیامِ پاکستان کے وقت مہاجرین نے ہندوستان میں اپنی جائیدادیں چھوڑیں، رشتے دار چھوڑے تو اس وقت ان کے کیا جذبات ہوں گے۔
- تحریکِ آزادی کی اہم شخصیات کی اہم تصاویر تلاش کرتے ہوئے ایک البم تیار کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے موضوع پر لکھے گئے نسیم حجازی کے ناول "خاک و خون" کا مختصر تعارف کرائیں۔
- پاکستان کے حوالے سے لکھے گئے کسی افسانے کا مختصر تعارف کرائیں۔
- آزادی کی اہمیت کو واضح کریں۔

سعادت حسن منٹو
(۱۹۱۲ء-۱۹۵۵ء)

سعادت حسن منٹو ضلع لدھیانہ (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے مگر اپنی تعلیمی سرگرمیوں کو ادھورا چھوڑ کر عملی زندگی کا آغاز کیا۔

آل انڈیا ریڈیو لاہور اور بمبئی سے وابستہ ہوئے۔ کئی فلمی رسالوں کی ادارت کی اور فلموں کی کہانیاں اور مکالمے تحریر کیے۔ منٹو نے بعض ایسے سماجی، سیاسی اور نفسیاتی موضوعات پر نہایت جرأت اور فنی نزاکت کے ساتھ قلم اٹھایا اور ایسی کہانیاں لکھنے میں کام یاب ہوئے جو صرف منٹو جیسے ادیب کا خاصہ قرار دی جاسکتی ہیں۔ انھوں نے اُردو افسانہ نگاری کو پُرتکلف زبان سے نجات دلا کر بے تکلفی کی فضا سے آشنا کیا۔ ان کی تحریروں کا اہم عنصر حقیقت نگاری اور سچائی ہے۔

منٹو قیامِ پاکستان کے بعد بمبئی سے لاہور آگئے لیکن یہاں انھیں معاشی تنگ دستی کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے زندگی کو ایک بازی کی طرح کھیلا اور ہار کر بھی جیت گئے۔ اپنی بیس سالہ ادبی زندگی میں انھوں نے سیکڑوں کی تعداد میں افسانے اور ڈرامے یادگار چھوڑے۔

انھوں نے روایتی تصورات پر کاری ضرب لگائی۔ اگرچہ منٹو کی بے باک اور حقیقت پسندانہ تحریریں بہت سے حلقوں کو ناگوار بھی گزرتی تھیں۔ تاہم وہ اس بات کی پروا کیے بغیر کہ "لوگ کیا کہیں گے" بے باکانہ لکھتے رہے اور انھیں اس ضمن میں کئی عدالتی کارروائیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، مگر وہ اپنے معاشرے کی بے ہودگیوں اور منافقتوں کا پردہ چاک کرنے سے باز نہ آئے۔

سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کے دنیا کی کئی زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں۔ ان کی تصانیف میں:

"سرگذشتِ اسیر"، "آتش پارے"، "لذتِ سنگ"، "چغد"، "نمرود کی خدائی"، "گنجے فرشتے" اور "لاؤڈ سپیکر" وغیرہ شامل ہیں۔

سبق: ۹

نیا قانون(۱)

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو ادبی زبان اور اسلوب سے روشناس کرانا۔
- منٹو کی حقیقت نگاری اور مختلف سماجی، سیاسی مسائل کی پیش کش سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ میں تنقیدی اور تخلیقی صلاحیتیں پیدا کرنا۔
- منٹو کے افسانوی کرداروں کے مثبت اور منفی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا۔
- طلبہ کو استعماریت اور استعماری ہتھکنڈوں سے آگاہ کرنا۔

منگو کوچوان اپنے اڈے میں بہت عقل مند سمجھا جاتا تھا۔ گو اس کی تعلیمی حیثیت صفر کے برابر تھی اور اس نے کبھی سکول کا مُنھ بھی نہیں دیکھا تھا لیکن اس کے باوجود اُسے دنیا بھر کی چیزوں کا علم تھا۔ اڈے کے وہ تمام کوچوان، جن کو یہ جاننے کی خواہش ہوتی تھی کہ دنیا کے اندر کیا ہو رہا ہے، استاد منگو کی وسیع معلومات سے اچھی طرح واقف تھے۔

پچھلے دنوں جب استاد منگو نے اپنی ایک سواری سے سپین میں جنگ چھڑ جانے کی افواہ سنی تھی تو اس نے گاما چودھری کے چوڑے کاندھے پر تھپکی دے کر مدبرانہ انداز میں پیشین گوئی کی تھی: ''دیکھ لینا گاما چودھری! تھوڑے ہی دنوں میں سپین کے اندر جنگ چھڑ جائے گی۔'' اور جب گاما چودھری نے اس سے یہ پوچھا کہ اسپین کہاں واقع ہے تو استاد منگو نے بڑی متانت سے جواب دیا تھا: ''ولایت میں اور کہاں؟''

سپین میں جنگ چھڑی اور جب ہر شخص کو اس کا پتا چل گیا تو اسٹیشن کے اڈے میں جتنے کوچوان حلقہ بنائے حُقّہ پی رہے تھے، دل ہی دل میں استاد منگو کی بڑائی کا اعتراف کر رہے تھے اور استاد منگو اس وقت مال روڈ کی چمکیلی سطح پر تانگا چلاتے ہوئے اپنی سواری سے تازہ ہندو مسلم فساد پر تبادلہ خیال کر رہا تھا۔

استاد منگو کو انگریزوں سے بڑی نفرت تھی اور اس نفرت کا سبب تو وہ یہ بتلایا کرتا تھا کہ وہ ہندوستان پر اپنا سِکّہ چلاتے ہیں اور طرح طرح کے ظلم ڈھاتے ہیں مگر اس کے تنفر کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ چھاؤنی کے گورے اُسے بہت ستایا کرتے تھے۔ وہ اس کے ساتھ ایسا سلوک کرتے تھے گویا وہ ایک ذلیل کتا ہے۔ اس کے علاوہ اسے ان کا رنگ بھی بالکل پسند نہ تھا۔ جب کبھی وہ گورے کے سرخ و سپید چہرے کو دیکھتا تو اسے متلی سی آجاتی۔ نا معلوم کیوں وہ کہا کرتا تھا کہ ان کے لال جھریوں بھرے چہرے کو دیکھ کر مجھے وہ لاش یاد آجاتی ہے جس کے جسم پر سے اوپر کی جھلی گل گل کر جھڑ رہی ہو۔

جب کسی نشے میں دھت گورے سے اس کا جھگڑا ہو جاتا تو سارا دن اس کی طبیعت مکدّر رہتی اور وہ شام کو اڈے میں آکر ہل مارکہ سگریٹ پیتا یا حقے کے کش لگاتے ہوئے اس گورے کو جی بھر کر سنایا کرتا۔ ''۔۔۔۔۔۔'' یہ موٹی گالی دینے کے بعد وہ اپنے سر کو ڈھیلی پگڑی

---

(۱) گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء، جو یکم اپریل ۱۹۳۷ء سے نافذ العمل ہوا۔

سمیت جھٹکا دے کر کہتا تھا: ''آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔''

اس پر بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوتا تھا۔ جب تک اس کا کوئی ساتھی اس کے پاس بیٹھا رہتا وہ اپنے سینے کی آگ اُگلتا رہتا: ''شکل دیکھتے ہو نا تم اس کی جیسے کوڑھ ہو رہا ہے۔ بالکل مُردار، ایک دھیلے کی مار اور گِٹ پٹ، گِٹ پٹ یوں بک رہا تھا جیسے مار ہی ڈالے گا۔ تیری جان کی قسم، پہلے پہل جی میں آئی کہ ملعون کی کھوپڑی کے پرزے اُڑادوں لیکن اس خیال سے ٹل گیا کہ اس مردود کو مارنا اپنی ہتک ہے۔'' یہ کہتے کہتے تھوڑی دیر کے لیے وہ خاموش ہو جاتا اور ناک کو خاکی قمیص کی آستین سے صاف کرنے کے بعد پھر بڑبڑانے لگ جاتا۔ ''قسم ہے بھگوان کی، ان لاٹ صاحبوں کے ناز اٹھاتے اٹھاتے تنگ آگیا ہوں۔ جب بھی ان کا منحوس چہرہ دیکھتا ہوں رگوں میں خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ کوئی نیا قانون وانون بنے تو ان لوگوں سے نجات ملے۔ تیری قسم! جان میں جان آجائے۔''

اور جب ایک روز استاد منگو نے کچہری سے اپنے تانگے پر دو سواریاں لادیں اور ان کی گفت گو سے اس کو پتا چلا کہ ہندوستان میں جدید آئین نافذ ہونے والا ہے تو اس کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔

دو مارواڑی جو کچہری میں اپنے دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے، گھر جاتے ہوئے جدید آئین یعنی انڈیا ایکٹ کے متعلق آپس میں بات چیت کر رہے تھے۔ ''سنا ہے پہلی اپریل سے ہندوستان میں نیا قانون چلے گا۔۔۔ یا ہر چیز بدل جائے گی؟''

''ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا۔ اور ہندوستانیوں کو آزادی مل جائے گی۔''

''کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟''

''یہ پوچھنے کی بات ہے، کل کسی وکیل سے دریافت کریں گے۔''

ان مارواڑیوں کی بات چیت استاد منگو کے دل میں ناقابلِ بیان خوشی پیدا کر رہی تھی۔ وہ اپنے گھوڑے کو ہمیشہ گالیاں دیتا تھا اور چابک سے بہت بری طرح پیٹا کرتا تھا مگر اُس روز وہ بار بار پیچھے مُڑ کر مارواڑیوں کی طرف دیکھتا اور اپنی بڑھی ہوئی مونچھوں کے بال ایک انگلی سے بڑی صفائی کے ساتھ اونچے کر کے گھوڑے کی پیٹھ پر باگیں ڈھیلی کرتے ہوئے بڑے پیار سے کہتا: ''چل بیٹا! ذرا ہوا سے باتیں کر کے دکھا دے۔''

مارواڑیوں کو ان کے ٹھکانے پر پہنچا کر اس نے انار کلی میں دینو حلوائی کی دکان پر آدھ سیر دہی کی لسّی پی کر ایک بڑی ڈکار لی اور مونچھوں کو منھ میں دبا کر ان کو چوستے ہوئے ایسے ہی بلند آواز میں کہا: ''ہت تیری ایسی کی تیسی!''

شام کو جب وہ اڈّے کو لوٹا تو خلافِ معمول اسے وہاں اپنی جان پہچان کا کوئی آدمی نہ مل سکا۔ یہ دیکھ کر اس کے سینے میں ایک عجیب و غریب طوفان برپا ہو گیا۔ آج وہ ایک بڑی خبر اپنے دوستوں کو سنانے والا تھا۔ بہت بڑی خبر، اور اس خبر کو اپنے اندر سے نکالنے کے لیے وہ سخت مجبور تھا لیکن وہاں کوئی تھا ہی نہیں۔

آدھ گھنٹے تک وہ چابک بغل میں دبائے اسٹیشن کے اڈّے کی آہنی چھت کے نیچے بے قراری کی حالت میں ٹہلتا رہا۔ اس کے دماغ

میں بڑے اچھے اچھے خیالات آ رہے تھے۔ نئے قانون کے نفاذ کی خبر نے اس کو ایک نئی دنیا میں لا کھڑا کر دیا تھا۔ وہ اس نئے قانون کے متعلق جو پہلی اپریل کو ہندوستان میں نافذ ہونے والا تھا، اپنے دماغ کی تمام بتیاں روشن کر کے غور و فکر کر رہا تھا۔ اس کے کانوں میں مارواڑی کا یہ اندیشہ: "کیا بیاج کے متعلق بھی کوئی نیا قانون پاس ہوگا؟" بار بار گونج رہا تھا اور اس کے تمام جسم میں مسرت کی ایک لہر دوڑا رہا تھا۔

وہ بے حد مسرور تھا۔ خاص کر اس وقت اس کے دل کو بہت ٹھنڈک پہنچتی جب وہ خیال کرتا کہ گوروں، سفید چوہوں (وہ اُن کو اسی نام سے یاد کیا کرتا تھا) کی تھوتھنیاں نئے قانون کے آتے ہی بلوں میں ہمیشہ کے لیے غائب ہو جائیں گی۔

جب نتھو گنجا پگڑی بغل میں دبائے اڈے میں داخل ہوا تو استاد منگو بڑھ کر اس سے ملا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر بلند آواز سے کہنے لگا: "لا ہاتھ ادھر۔۔۔ ایسی خبر سناؤں کہ جی خوش ہو جائے۔ تیری اس گنجی کھوپڑی پر بال اُگ آئیں۔" اور یہ کہہ کر منگو نے بڑے مزے لے لے کر نئے قانون کے متعلق اپنے دوست سے باتیں شروع کر دیں۔ دورانِ گفت گو میں اس نے کئی مرتبہ نتھو گنجے کے ہاتھ پر زور سے اپنا ہاتھ مار کر کہا: "تُو دیکھتا رہ کیا بنتا ہے، یہ "رُوس والا بادشاہ" کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔"

استاد منگو موجودہ سوویت نظام کی اشتراکی سرگرمیوں کے متعلق بہت کچھ سن چکا تھا اور اسے وہاں کے نئے قانون اور دوسری نئی چیزیں بہت پسند تھیں، اسی لیے اس نے روس والے بادشاہ کو "انڈیا ایکٹ" یعنی جدید آئین کے ساتھ ملا دیا اور پہلی اپریل کو پرانے نظام میں جو نئی تبدیلیاں ہونے والی تھیں وہ انھیں "رُوس والے بادشاہ" کے اثر کا نتیجہ سمجھتا تھا۔

کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں سرخ پوشوں کی تحریک جاری تھی۔ استاد منگو نے اس تحریک کو اپنے دماغ میں "رُوس والے بادشاہ" اور پھر نئے قانون کے ساتھ خلط ملط کر دیا تھا۔ اس کے علاوہ جب کبھی وہ کسی سے سنتا کہ فلاں شہر میں اتنے بم ساز پکڑے گئے ہیں یا فلاں جگہ اتنے آدمیوں پر بغاوت کے الزام میں مقدمہ چلایا گیا ہے تو ان تمام واقعات کو نئے قانون کا پیش خیمہ سمجھتا اور دل ہی دل میں خوش ہوتا۔

ایک روز اس کے تانگے میں دو بیرسٹر بیٹھے نئے آئین پر بڑے زور سے تبادلۂ خیال کر رہے تھے اور وہ خاموشی سے ان کی باتیں سُن رہا تھا۔ ان میں سے ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا: "جدید آئین کا دوسرا حصہ فیڈریشن ہے جو میری سمجھ میں ابھی تک نہیں آسکا۔ ایسی فیڈریشن دنیا کی تاریخ میں آج تک نہ سنی، نہ دیکھی گئی۔ سیاسی نظریہ سے بھی یہ فیڈریشن بالکل غلط ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ یہ کوئی فیڈریشن ہے ہی نہیں۔"

ان بیرسٹروں کے درمیان جو گفت گو ہوئی اس میں بیش تر الفاظ انگریزی کے تھے۔ اس لیے استاد منگو صرف اوپر کے جملے ہی کو کسی قدر سمجھا اور اس نے کہا: "یہ لوگ ہندوستان میں نئے قانون کی آمد کو برا سمجھتے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا وطن آزاد ہو۔" چناں چہ اس خیال کے زیرِ اثر اس نے کئی مرتبہ ان دو بیرسٹروں کو حقارت کی نگاہوں سے دیکھ کر دل ہی دل میں کہا: "ٹوڈی بچے!"

جب کبھی وہ کسی کو دبی زبان میں "ٹوڈی بچہ" کہتا تو دل میں یہ محسوس کر کے بڑا خوش ہوتا تھا کہ اس نے اس نام کو صحیح جگہ استعمال کیا ہے، اور یہ کہ وہ شریف آدمی اور "ٹوڈی بچے" میں تمیز کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

اس واقعے کے تیسرے روز گورنمنٹ کالج کے تین طلبہ کو اپنے تانگے میں بٹھا کر مزنگ جا رہا تھا کہ اس نے ان تین لڑکوں کو آپس میں یہ باتیں کرتے سنا: "نئے آئین نے میری امیدیں اور بڑھا دی ہیں اگر۔۔۔ صاحب اسمبلی کے ممبر ہو گئے تو کسی سرکاری دفتر میں ملازمت ضرور مل جائے گی۔"

"ویسے بھی بہت سی جگہیں اور نکلیں گی۔ شاید اسی گڑبڑ میں ہمارے ہاتھ بھی کچھ آ جائے۔"

"ہاں ہاں کیوں نہیں۔"

"وہ بے کار گریجویٹ جو مارے مارے پھر رہے ہیں، ان میں کچھ تو کمی ہوگی۔"

اس گفت گو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بھی بڑھا دی اور وہ اس کو ایسی "چیز" سمجھنے لگا جو بہت چمکتی ہو۔ "نیا قانون!" اور وہ دن میں کئی بار سوچتا، یعنی کوئی نئی چیز! اور ہر بار اس کی نظروں کے سامنے اپنے گھوڑے کا وہ ساز آ جاتا جو اس نے دو برس ہوئے چودھری خدا بخش سے بڑی اچھی طرح ٹھونک بجا کر خریدا تھا۔ اس ساز پر، جب وہ نیا تھا، جگہ جگہ لوہے کی نکل چڑھی ہوئی کیلیں چمکتی تھیں اور جہاں جہاں پیتل کا کام تھا وہ تو سونے کی طرح دمکتا تھا۔ اس لحاظ سے بھی "نئے قانون" کا درخشاں و تاباں ہونا ضروری تھا۔

پہلی اپریل تک استاد منگو نے جدید آئین کے خلاف اور اس کے حق میں بہت کچھ سنا مگر اس کے متعلق جو تصور وہ اپنے ذہن میں قائم کر چکا تھا، بدل نہ سکا۔ وہ سمجھتا تھا کہ پہلی اپریل کو نئے قانون کے آتے ہی سب معاملہ صاف ہو جائے گا اور اس کو یقین تھا کہ اس کی آمد پر جو چیزیں نظر آئیں گی ان سے اس کی آنکھوں کو ضرور ٹھنڈک پہنچے گی۔

آخر کار مارچ کے اکتیس دن ختم ہو گئے اور اپریل کے شروع ہونے میں رات کے چند خاموش گھنٹے باقی رہ گئے۔ موسم خلاف معمول سرد تھا اور ہوا میں تازگی تھی۔ پہلی اپریل کو صبح سویرے استاد منگو اٹھا اور اصطبل میں جا کر گھوڑے کو جوتا اور باہر نکل گیا۔ اس کی طبیعت آج غیر معمولی طور پر مسرور تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنے والا تھا۔

اس نے صبح کے سرد دھندلکے میں کئی تنگ اور کھلے بازاروں کا چکر لگایا مگر اسے ہر چیز پرانی نظر آئی۔ آسمان کی طرح پرانی۔ اس کی نگاہیں آج خاص طور پر نیا رنگ دیکھنا چاہتی تھیں مگر سوائے اس کلغی کے جو رنگ برنگ کے پروں سے بنی تھی اور اس کے گھوڑے کے سر پر جمی ہوئی تھی اور سب چیزیں پرانی نظر آتی تھیں۔ یہ نئی کلغی اس نے نئے قانون کی خوشی میں یکم مارچ کو چودھری خدا بخش سے ساڑھے چودہ آنے میں خریدی تھی۔

گھوڑے کی ٹاپوں کی آواز، کالی سڑک اور اس کے آس پاس تھوڑا تھوڑا فاصلہ چھوڑ کر لگائے ہوئے بجلی کے کھمبے، دکانوں کے بورڈ، اس کے گھوڑے کے گلے میں پڑے ہوئے گھنگھرو کی جھنجھناہٹ، بازار میں چلتے پھرتے آدمی۔۔۔ ان میں سے کون سی چیز نئی تھی؟، ظاہر ہے کہ کوئی بھی نہیں۔ لیکن استاد منگو مایوس نہیں تھا۔

"ابھی بہت سویرا ہے۔ دکانیں بھی تو سب کی سب بند ہیں۔" اس خیال سے اسے تسکین تھی۔ اس کے علاوہ وہ یہ بھی سوچتا تھا: "ہائی کورٹ میں نو بجے کے بعد ہی کام شروع ہوتا ہے۔ اب اس سے پہلے نئے قانون کا کیا نظر آئے گا؟"

جب اس کا تانگا گورنمنٹ کالج کے دروازے کے قریب پہنچا تو کالج کے گھڑیال نے بڑی رعونت سے نو بجائے۔ جو طلبہ کالج کے بڑے دروازے سے باہر نکل رہے تھے خوش پوش تھے، مگر استاد منگو کو نہ جانے ان کے کپڑے میلے میلے سے کیوں نظر آئے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی، کہ اس کی نگاہیں آج کسی خیرہ کن جلوے کا نظارہ کرنے والی تھیں۔

تانگے کو دائیں ہاتھ موڑ کر وہ تھوڑی دیر کے بعد پھر انار کلی میں تھا۔ بازار کی آدھی دکانیں کھل چکی تھیں اور اب لوگوں کی آمد و رفت بھی بڑھ گئی تھی۔ حلوائی کی دکانوں پر گاہکوں کی خوب بھیڑ تھی۔ منہاری والوں کی نمائشی چیزیں شیشے کی الماریوں میں لوگوں کو دعوتِ نظارہ دے رہی تھیں اور بجلی کے تاروں پر کئی کبوتر آپس میں لڑ جھگڑ رہے تھے۔ مگر استاد منگو کے لیے ان تمام چیزوں میں کوئی دل چسپی نہ تھی۔ وہ نئے قانون کو دیکھنا چاہتا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح وہ اپنے گھوڑے کو دیکھ رہا تھا۔

کچھ بھی ہو مگر استاد منگو نئے قانون کے انتظار میں اتنا بے قرار نہیں تھا جتنا کہ اسے اپنی طبیعت کے لحاظ سے ہونا چاہیے تھا۔ وہ آج نئے قانون کو دیکھنے کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے گاندھی یا جواہر لال کے جلوس کا نظارہ کرنے کے لیے نکلا کرتا تھا۔

لیڈروں کی عظمت کا اندازہ استاد منگو ہمیشہ ان کے جلوس کے ہنگاموں اور ان کے گلے میں ڈالے ہوئے پھولوں کے ہاروں سے کیا کرتا تھا۔ اگر کوئی لیڈر گیندے کے پھولوں سے لدا ہو تو استاد منگو کے نزدیک وہ بڑا آدمی تھا اور اگر کسی لیڈر کے جلوس میں بھیڑ کے باعث دو تین فساد ہوتے ہوتے رہ جائیں تو اس کی نگاہوں میں وہ اور بھی بڑا تھا۔ اب نئے قانون کو وہ اپنے ذہن کے اسی ترازو میں تولنا چاہتا تھا۔

انار کلی سے نکل کر وہ مال روڈ کی چمکیلی سطح پر اپنے تانگے کو آہستہ آہستہ چلا رہا تھا کہ موٹروں کی دکان کے پاس اسے چھاؤنی کی ایک سواری مل گئی۔ کرایہ طے کرنے کے بعد اس نے اپنے گھوڑے کو چابک دکھایا اور دل میں یہ خیال کیا: ''چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ شاید چھاؤنی ہی سے نئے قانون کا کچھ پتا چل جائے۔''

وہ نئے قانون کی موجودگی میں میونسپل کمیٹی سے تانگوں کے نمبر ملنے کے طریقے پر غور کر رہا تھا وہ اس قابلِ غور بات کو آئینِ جدید کی روشنی میں دیکھنے کی سعی کر رہا تھا۔ وہ اس سوچ بچار میں غرق تھا۔ اسے یوں معلوم ہوا جیسے کسی سواری نے اسے بلایا ہے۔ پیچھے پلٹ کر دیکھنے سے اسے سڑک کے اس طرف دور بجلی کے کھمبے کے پاس ایک ''گورا'' کھڑا نظر آیا جو اسے ہاتھ سے بلا رہا تھا۔

جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے استاد منگو کو گوروں سے بے حد نفرت تھی۔ جب اس نے اپنے تازہ گاہک کو گورے کی شکل میں دیکھا تو اس کے دل میں نفرت کے جذبات بیدار ہو گئے۔ پہلے تو اس کے جی میں آئی کہ بالکل توجہ نہ دے اور اس کو چھوڑ کر چلا جائے مگر بعد میں اس کو خیال آیا ان کے پیسے چھوڑنا بھی بے وقوفی ہے۔ کلغی پر جو مفت میں ساڑھے چودہ آنے خرچ کر دیے ہیں ان کی جیب ہی سے وصول کرنے چاہییں۔ چلو چلتے ہیں۔

خالی سڑک پر بڑی صفائی سے تانگا موڑ کر اس نے گھوڑے کو چابک دکھایا اور آنکھ جھپکنے میں وہ بجلی کے کھمبے کے پاس تھا۔ گھوڑے کی باگیں کھینچ کر اس نے تانگا ٹھہرایا اور پچھلی نشست پر بیٹھے بیٹھے گورے سے پوچھا:

''صاحب بہادر! کہاں جانا مانگتا ہے؟''

اس سوال میں بلا کا طنزیہ انداز تھا۔ صاحب بہادر کہتے وقت اس کا اوپر کا مونچھوں بھرا ہونٹ نیچے کی طرف کھنچ گیا اور پاس ہی گال کے اس طرف جو مدھم سی لکیر ناک کے نتھنے سے تھوڑی کے بالائی حصے تک چلی آ رہی تھی، ایک لرزش کے ساتھ گہری ہوگئی، گویا کسی نے نوکیلے چاقو سے شیشم کی سانولی لکڑی میں دھاری ڈال دی ہے۔ اس کا چہرہ ہنس رہا تھا اور اپنے اندر اس نے اس "گورے" کو سینے کی آگ میں جلا کر بھسم کر ڈالا تھا۔

استاد منگو جو اپنے دائیں ہاتھ سے باگ کے بل کھول کر تانگے پر سے نیچے اترنے والا تھا اپنے سامنے کھڑے گورے کو یوں دیکھ رہا تھا گویا وہ اس کے وجود کے ذرّے ذرّے کو اپنی نگاہوں سے چبا رہا ہے اور گورا کچھ اس طرح اپنی نیلی پتلون پر سے غیر مرئی چیزیں جھاڑ رہا ہے، گویا وہ استاد منگو کے اس حملے سے اپنے وجود کے کچھ حصے کو محفوظ رکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔

گورے نے سگریٹ کا دھواں نگلتے ہوئے کہا: "جانا مانگٹا یا پھر گڑ بڑ کرے گا؟"

"وہی ہے۔" یہ الفاظ استاد منگو کے ذہن میں پیدا ہوئے اور اس کی چوڑی چھاتی کے اندر ناچنے لگے۔

"وہی ہے۔" اس نے یہ الفاظ اپنے منھ کے اندر ہی اندر دہرائے اور ساتھ ہی اسے پورا یقین ہوگیا کہ وہ گورا جو اس کے سامنے کھڑا تھا وہی ہے جس سے پچھلے برس اس کی جھڑپ ہوئی تھی اور اس خواہ مخواہ کے جھگڑے میں جس کا باعث گورے کے دماغ میں چڑھا ہوا نشہ تھا۔ اسے طوعاً و کرہاً بہت سی باتیں سہنا پڑی تھیں۔ استاد منگو نے گورے کا دماغ درست کر دیا ہوتا بلکہ اس کے پرزے اڑا دیے ہوتے مگر وہ کسی خاص مصلحت کی بنا پر خاموش ہو گیا تھا۔ اس کو معلوم تھا کہ اس قسم کے جھگڑوں میں عدالت کا نزلہ عام طور پر کوچوانوں ہی پر گرتا ہے۔

استاد منگو نے پچھلے برس کی لڑائی اور پہلی اپریل کے نئے قانون پر غور کرتے ہوئے گورے سے کہا: "کہاں جانا مانگتا ہے؟"

استاد منگو کے لہجے میں چابک جیسی تیزی تھی۔ گورے نے جواب دیا: "ٹکسالی"

"کرایہ پانچ روپے ہوگا۔" استاد منگو کی مونچھیں تھرتھرائیں۔"

یہ سن کر گورا حیران ہوگیا۔ وہ چلایا! "پانچ روپے۔ کیا تم ۔۔۔۔؟"

"ہاں، ہاں، پانچ روپے۔" یہ کہتے ہوئے استاد منگو کا داہنا بالوں بھرا ہاتھ بھنچ کر ایک وزنی گھونسے کی شکل اختیار کر گیا۔ "کیوں، جاتے ہو یا بے کار باتیں بناؤ گے؟" استاد منگو کا لہجہ زیادہ سخت ہوگیا۔

گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو نظر انداز کر چکا تھا۔ وہ خیال کر رہا تھا کہ اس کی کھوپڑی پھر کھجلا رہی ہے۔ اس حوصلہ افزا خیال کے زیرِ اثر وہ تانگے کی طرف اکڑ کر بڑھا اور اپنی چھڑی سے استاد منگو کو تانگے پر سے نیچے اترنے کا اشارہ کیا۔ بید کی یہ پالش کی ہوئی پتلی چھڑی استاد منگو کی موٹی ران کے ساتھ دو تین مرتبہ چھوئی۔ اس نے کھڑے کھڑے اوپر سے پستہ قد گورے کو دیکھا۔ گویا وہ اپنی نگاہوں کے وزن ہی سے اسے پیس ڈالنا چاہتا ہے۔ پھر اس کا گھونسہ کمان میں سے تیر کی طرح سے اوپر کو اٹھا اور چشمِ زدن میں گورے کی ٹھڈی کے نیچے جم گیا۔ دھکا دے کر اس نے گورے کو پرے ہٹایا اور نیچے اتر کر اسے دھڑا دھڑ پیٹنا شروع کر دیا۔

ششدر و متحیر گورے نے اِدھر اُدھر سٹ کر استاد منگو کے وزنی گھونسوں سے بچنے کی کوشش کی اور جب دیکھا کہ اس کے مخالف پر دیوانگی کی سی حالت طاری ہے اور اس کی آنکھوں میں شرارے برس رہے ہیں تو اس نے زور زور سے چلّانا شروع کیا۔ اس چیخ پکار نے استاد منگو کی بانہوں کا کام اور بھی تیز کر دیا وہ گورے کو جی بھر کے پیٹ رہا تھا اور ساتھ ساتھ یہ کہتا جاتا تھا: ''پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔۔۔ پہلی اپریل کو بھی وہی اکڑفوں۔ اب ہمارا راج ہے بچّہ!''

لوگ جمع ہو گئے اور پولیس کے دو سپاہیوں نے بڑی مشکل سے گورے کو استاد منگو کی گرفت سے چھڑایا۔ استاد منگو ان دو سپاہیوں کے درمیان کھڑا تھا۔ اس کی چوڑی چھاتی پھولی سانس کی وجہ سے اوپر نیچے ہو رہی تھی۔ منھ سے جھاگ بہ رہا تھا اور اپنی مسکراتی ہوئی آنکھوں سے حیرت زدہ مجمع کی طرف دیکھ کر وہ ہانپتی ہوئی آواز میں کہہ رہا تھا:

''وہ دن گزر گئے جب خلیل خاں فاختہ اڑایا کرتے تھے۔ اب نیا قانون ہے میاں۔ نیا قانون!''

اور بے چارہ گورا اپنے بگڑے ہوئے چہرے کے ساتھ بے وقوفوں کی مانند کبھی استاد منگو کی طرف دیکھتا تھا اور کبھی ہجوم کی طرف۔

استاد منگو کو پولیس کے سپاہی تھانے میں لے گئے۔ راستے میں اور تھانے کے اندر کمرے میں وہ ''نیا قانون، نیا قانون'' چلّاتا رہا مگر کسی نے ایک نہ سنی۔

''نیا قانون، نیا قانون! کیا بک رہے ہو؟ قانون وہی ہے پرانا!''

اور اس کو حوالات میں بند کر دیا گیا۔

(کلیاتِ منٹو)

مشق

ا۔ مختصر جواب دیں:

(الف) استاد منگو کی کیا انفرادیت تھی؟

(ب) ''یہ رُوس والا بادشاہ کچھ نہ کچھ ضرور کر کے رہے گا۔'' یہ بات کس نے کس سے کہی؟

(ج) استاد منگو کو انگریزوں سے نفرت کیوں تھی؟

(د) ''آگ لینے آئے تھے اب گھر کے مالک ہی بن گئے ہیں۔ ناک میں دم کر رکھا ہے ان بندروں کی اولاد نے۔ یوں رعب گانٹھتے ہیں گویا ہم ان کے باوا کے نوکر ہیں۔'' متن کے مطابق منگو نے یہ باتیں کس تناظر میں کیں؟

(ہ) استاد منگو نئے قانون کے بارے میں کیا سوچ رکھتا تھا؟

(و) استاد منگو کے نزدیک بڑے لیڈر کا کیا معیار تھا؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) منگو نے کس ملک کی لڑائی کی پیشین گوئی کی؟

(الف) سپین (ب) برطانیہ (ج) فرانس (د) روس

(ii) "نیا قانون" اصنافِ ادب کے لحاظ سے ہے:

(الف) ناول (ب) ڈراما (ج) داستان (د) افسانہ

(iii) دیوانی مقدمے کے سلسلے میں آئے تھے:

(الف) انگریز (ب) مارواڑی (ج) کوچوان (د) بنگالی

(iv) کس کی گفت گو نے استاد منگو کے دل میں جدید آئین کی اہمیت اور بڑھا دی؟

(الف) انگریز کی (ب) ایک کوچوان کی (ج) طلبہ کی (د) بیرسٹر کی

(v) منگو نے چودھری خدا بخش سے خریدا تھا:

(الف) گھوڑا (ب) ساز (ج) کاٹھی (د) پائے دان

۳۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب الفاظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں:

(الف) استاد منگو کو ______ سے بڑی نفرت تھی۔

(ب) ہر چیز تو نہیں بدلے گی مگر کہتے ہیں کہ بہت کچھ بدل جائے گا اور ______ کو آزادی مل جائے گی۔

(ج) کچھ عرصے سے پشاور اور دیگر شہروں میں ______ کی تحریک جاری تھی۔

(د) اس گفت گو نے استاد منگو کے دل میں جدید ______ کی اہمیت اور بھی بڑھا دی۔

(ہ) گورا پچھلے برس کے واقعے کو پیشِ نظر رکھ کر استاد منگو کے سینے کی چوڑائی کو ______ کر چکا تھا۔

۴۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

جس طرح پوری کائنات کا نظام قانونِ قدرت کے تحت چل رہا ہے مثلاً سورج اور چاند ستاروں کا طلوع و غروب، موسموں کا تغیر و تبدل، فصلوں کا پکنا وغیرہ سب ایک قانون کے تابع ہیں، اسی طرح معاشرے کی فلاح و بہبود، امن و امان اور ترقی و خوش حالی کے لیے بھی انسانوں نے قوانین ترتیب دیے ہوئے ہیں۔ ان قوانین پر عمل پیرا ہونے سے معاشرے کے افراد کو بھی راحت ملتی ہے اور معاشرہ بھی مہذب بن جاتا ہے۔ کسی معاشرے میں افراتفری، بدامنی اور بے سکونی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب اس کے افراد قانون شکنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ جب قانون شکن گرفت میں آتے ہیں تو ایک طرف ان کی ذاتی زندگی پیچیدگیوں کا شکار ہوتی ہے تو دوسری طرف اس سے منسلک افراد اور معاشرہ بھی اپنا وقار کھونے لگتا ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم قانون کی گرفت میں آنے کے خوف سے اس پر عمل کریں، ہمیں چاہیے کہ سماجی قدروں کو

فروغ دیتے ہوئے خلوصِ دل سے قانونی تقاضوں کا احساس کریں اور ایک مہذب معاشرہ تشکیل دیں۔ ترقی یافتہ ممالک کی نسبت ہمارے ملک میں شرحِ خواندگی بہت کم ہے۔ اس وجہ سے بہت سے لوگ قوانین پر عمل کرنے کا شعور نہیں رکھتے۔ ہمیں اپنے اردگرد جہاں زندگی کے دیگر شعبوں میں بے ضابطگیاں نظر آتی ہیں وہاں بدقسمتی سے ٹریفک کے قوانین پر عمل کرنے کے شعور کے فقدان کا بھی سامنا ہے۔ قانونی پیچیدگیوں سے قطع نظر، اگر ہم اخلاقی نقطۂ نظر سے بھی دیکھیں تو ٹریفک قوانین کی پابندی کرنا نہایت ضروری ہے۔ انھیں نظرانداز کرنے سے معاشرتی صورتِ حال بگڑنے کے علاوہ قیمتی جانیں بھی ضائع ہوتی ہیں۔ ٹریفک قوانین کی خلاف ورزی روکنے کے لیے نہ صرف ٹریفک پولیس ذمہ داری کا مظاہرہ کرے بلکہ عوام الناس میں بھی احساسِ ذمہ داری پیدا ہونا چاہیے۔

سوالات:

- عبارت کے مطابق قانونِ قدرت کی کیا کیا مثالیں ہیں؟
- معاشرہ مہذب کیسے بنتا ہے؟
- ٹریفک قوانین کو نظرانداز کرنے کے کیا نقصان ہیں؟
- ہمارے معاشرے میں لوگ قوانین پر عمل کرنے کا شعور کیوں نہیں رکھتے؟
- اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

زبان شناسی

۵۔ واحد جمع اور تذکیر و تانیث کو مدِنظر رکھتے ہوئے جملے درست کریں۔

غلط جملے	درست جملے
یہاں ہر امراض کا علاج ہوتا ہے۔	
اسے ابھی تک ہوش نہیں آئی۔	
میں نے ہر ممالک کی سیر کی ہے۔	
لوگ گہری غاروں میں رہتے تھے۔	
فٹ بال میری پسندیدہ کھیل ہے۔	
رات میں نے ایک خواب دیکھی۔	
میری قلم کہاں ہے؟	
رابعہ یہ بات سن کر تکی تکی رہ گئی۔	

۶۔ درج ذیل الفاظ پر درست اعراب لگائیں:

عقل، حیثیت، اعتراف، نشست، مصلحت

۷۔ درج ذیل ضرب الامثال درست کرکے لکھیں:

	ایک انار ہزار بیمار
	پانی دیکھو، پانی کی دھار دیکھو
	دھوبی کا کتا نہ گھر کا نہ باہر کا
	جس کی لاٹھی اس کی گائے
	بچہ گود میں ڈھنڈورا شہر میں
	دودھ کا جلا لسی بھی پھونک کر پیتا ہے
	ناچ نہ جانے پاؤں ٹیڑھا
	آسمان سے گرا جامن میں اٹکا
	گیہوں کے ساتھ جَو بھی پس جاتا ہے
	نہ دس من تیل ہوگا، نہ رادھا ناچے گی

۸۔ سبق "نیا قانون" کا خلاصہ تحریر کریں۔

سرگرمی برائے طلبہ:

- افسانہ "نیا قانون" کے اہم حصے رول پلے کی صورت میں پیش کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- اساتذہ منٹو کے دیگر افسانوں بالخصوص "تماشا" اور "ٹوبہ ٹیک سنگھ" کا تعارف کرائیں۔
- "نیا قانون" کے طنزیہ اسلوب پر روشنی ڈالیں۔

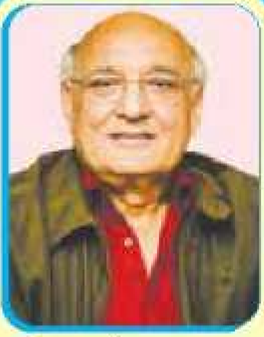

امجد اسلام امجد

(۱۹۴۴ء۔ ۲۰۲۳ء)

امجد اسلام امجد لاہور میں پیدا ہوئے۔ اُنھوں نے اسلامیہ کالج، سول لائنز لاہور سے بی۔اے کرنے کے بعد پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج، لاہور سے اُردو میں ایم۔اے امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔

تعلیم مکمل کرنے کے بعد انھوں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ایم اے او کالج، لاہور سے کیا جہاں ۱۹۶۸ء سے لے کر ۱۹۷۵ء تک شعبۂ اردو میں لیکچرر رہے۔ کچھ عرصے بعد اسی ادارے میں ۱۹۸۹ء سے ۱۹۹۷ء تک ایسوسی ایٹ پروفیسر رہے اور پھر ۱۹۹۷ء سے لے کر ریٹائرمنٹ تک چلڈرن لائبریری کمپلیکس اور اردو سائنس بورڈ، لاہور سے ڈائریکٹر جنرل کی حیثیت سے وابستہ رہے۔

امجد اسلام امجد نے بطور شاعر، ڈراما نویس، سفرنامہ نگار، نقاد اور مترجم کی حیثیت سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔ خاص طور پر وہ ٹیلی ڈراما نویس کی حیثیت سے کافی معروف ہوئے۔ انھیں ۱۹۸۷ء میں تمغائے حسنِ کارکردگی، ۱۹۹۸ء میں ستارۂ امتیاز اور ۲۰۲۳ء میں ہلالِ امتیاز کے اعزازات سے نوازا گیا۔

انھوں نے بے شمار ڈرامے لکھے جن میں "وارث"، "اپنے لوگ" اور "دہلیز" کو عوام و خواص نے بہت پسند کیا اور انھیں بشمول چینی زبان کے کئی زبانوں میں "ڈب" کیا گیا۔ امجد اسلام امجد اپنے حوالے سے ایک جگہ لکھتے ہیں:

"میری زندگی کے اہم اور دل چسپ واقعات بہت سے ہیں۔ مثلاً: یہی بات اپنی جگہ بہت اہم ہے کہ میں اپنی زندگی کے دوران میں کرکٹ کا کھلاڑی تھا اور اسی میدان میں نام پیدا کرنا چاہتا تھا مگر آگے چل کر میری پہچان شاعری اور ڈراما بنے۔"

ڈراما دہلیز کے ہدایت کاروں میں قنبر علی شاہ، یاور حیات، کنور آفتاب احمد اور نصرت ٹھاکر تھے۔ اس ڈرامے میں محمد قوی خان، روحی بانو، عظمیٰ گیلانی، محبوب عالم، فردوس جمال، اورنگزیب لغاری، مونا صدیقی، خورشید کمال اور جمیل فخری سمیت دیگر فنکاروں نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ یہ ڈراما 1981ء میں پہلی بار پاکستان ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا۔

امجد اسلام امجد کی اہم تصانیف میں "بارش کی آواز"، "شام سرائے"، "اتنے خواب کہاں رکھوں"، "ساتواں در"، "برزخ" (شعری مجموعے) اور "وارث"، "دہلیز"، "سمندر"، "گردش"، "دن"، "رات"، "وقت" (ڈرامے) وغیرہ شامل ہیں۔

سبق: ۱۰

دہلیز

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو فنِ ڈراما نگاری سے آشنا کرنا۔
- اُردو ادب میں ڈراما نگاری کی روایت اور نمایندہ ڈراما نگاروں کے بارے میں معلومات فراہم کرنا۔
- امجد اسلام امجد کی شخصیت اور مختلف ادبی، شعری جہات کے بارے میں بتانا۔
- ڈراما "دہلیز" کا فکری اور فنی جائزہ لینا۔

[**تعارف:** احمد علی ایک کاروباری شخص ہے جو شہر میں ایک نئے پلازے کی تعمیر کا منصوبہ بنا رہا ہے۔ نقشہ نویس رحمٰن کا مشورہ ہے کہ پلازے سے ملحقہ مکان اگر شامل ہو جائے تو گراؤنڈ فلور پر سینما بھی تعمیر ہو سکتا ہے۔ مطلوبہ مکان احمد علی کے رشتے کے بھائی فقیر حسین کا ہے۔ احمد علی، فقیر حسین کو مختلف حیلوں بہانوں سے مکان بیچنے پر راضی کرنے کی کوشش کرتا ہے، اسے بہتر متبادل مکان کا لالچ بھی دیتا ہے لیکن فقیر حسین راضی نہیں ہوتا۔ احمد علی کا بیٹا عابد زبردستی مکان حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ فقیر حسین، اس کا بیٹا اختر اور بیٹی سعیدہ، عابد کے ناجائز حربوں سے بہت تنگ رہتے ہیں۔ اختر کا ایک دوست رفیق ہے جو بظاہر ایک بُرا اور جرائم پیشہ نوجوان ہے، وہ اختر کی مدد کرتا ہے۔ ایک کردار جاگیردار جہاں گیر کا ہے جو زمین کو اپنے ناجائز مقاصد کے لیے استعمال کرتا ہے۔ آخرِ کار قدرت انتقام لیتی ہے اور جہاں گیر کی حویلی کو آگ لگتی ہے جس سے وہ جل کر مر جاتا ہے۔ احمد علی اور فقیر حسین کے گھرانوں کے درمیان کش مکش جاری رہتی ہے۔ احمد علی بیمار ہوتا ہے تو فقیر حسین بڑے خلوص کے ساتھ اس کی تیمارداری کرتا ہے۔ آخر کار ان کے خاندان کی رنجشیں ختم ہو جاتی ہیں۔ احمد علی کا ایک بیٹا خالد ہے جو نیک فطرت ہے اور فقیر حسین کی بیٹی سعیدہ میں دلچسپی رکھتا ہے۔ سعیدہ بھی اس کے لیے پسندیدہ جذبات رکھتی ہے لیکن آخر میں وہ رفیق کے باطنی کردار سے متاثر ہو کر اس کا اخلاقی سہارا بننے کی خاطر اس کے ساتھ شادی کا فیصلہ کر لیتی ہے۔]

کردار:

فقیر حسین	اختر	سعیدہ	احمد علی	خالد
نیلم	عابد	رفیق	سلامت	جہاں گیر
سلمیٰ				

باب: ۱۹، سین: ۱۴۰

رفیق کا ڈیرا: (سعیدہ اور اختر قدرے EXCITED (پُرجوش) انداز میں آتے ہیں۔ ڈیرا خالی ہے۔ چاروں طرف دیکھتے ہیں۔)

اختر: رفیق صاحب!

سعیدہ: کہاں گیا وہ۔۔۔ رفیق۔۔۔ رفیق صاحب۔۔۔ رفیق صاحب!

(بے چینی سے چاروں طرف دیکھتی ہے۔۔۔)

میں نے کہا بھی تھا کہ۔۔۔

(ایک دم اندرونی دروازے کو کھلتے ہوئے دیکھ کر رُک جاتی ہے۔ رفیق دروازے میں خاموش کھڑا ہے۔ اس کے پیچھے سلامت ہے، اختر ان کی طرف بڑھتا ہے۔)

اختر: (اطمینان کا سانس لیتے ہوئے) اوہ! ہم تو گھبرا ہی گئے تھے۔۔۔۔۔۔

سلامت: (آگے آتے ہوئے) السلام علیکم باجی جی۔۔۔ کیا حال ہے یار با؟

اختر: تمھاری دعا ہے سلامت۔ آپ کے لیے ایک خوش خبری ہے رفیق صاحب!

سعیدہ: (بچوں کی طرح جلدی سے بات کرتی ہے) سردار جہانگیر جل کر مر گیا ہے۔ (رفیق اثبات میں سر ہلاتا ہے)

سعیدہ: (حیرت سے) آپ کو پتا لگ گیا ہے؟

رفیق: جی ہاں۔ آپ نے مجھے اس سے دور رہنے کو کہا تھا، غافل رہنے کو تو نہیں۔

(سعیدہ لاجواب سی ہو کر خواہ مخواہ مسکرا دیتی ہے۔ رفیق ایک دھاگے کو انگلیوں میں بار بار لپیٹتے اور کھولتے ہوئے بولتا ہے۔)

بیٹھیں ناں آپ لوگ۔

اختر: نہیں رفیق صاحب! ہم دراصل یہی بتانے آئے تھے۔

سلامت: لو جی! یہ کیسے ہو سکتا ہے۔۔۔۔ کچھ نہ کچھ تو ہونا چاہیے۔۔۔۔ آپ بتائیں باجی جی، پیڑوں کی لسی پیش کروں؟

سعیدہ: (حیرت سے) کیا؟

سلامت: (ہاتھوں سے لسی بنانے کا سٹائل بناتا ہے) پیڑوں کی لسی۔۔۔۔ پیڑے نہیں پتا آپ کو؟ (سعیدہ نفی میں سر ہلاتی ہے) وہ جو ہوتے ہیں، کھوئے کے گول گول۔۔۔ دودھ یا دہی میں ڈال کے بناتے ہیں اس کو۔۔۔ بڑی اعلیٰ نسل کی چیز ہے۔۔۔ بڑی نیند آتی ہے اس کے بعد۔

اختر: (ہنستے ہوئے) یار سلامت! ایک تو تجھے ہر وقت کچھ نہ کچھ کھانے کی پڑی رہتی ہے۔

سلامت: تم مت بولو یار بیچ میں۔ میں باجی جی سے پوچھ رہا ہوں۔ تم ایسے ہی خواہ مخواہ۔۔۔

سعیدہ: نہیں سلامت بھائی۔ شکریہ۔ اب ہم چلیں گے۔ (رفیق سے) آپ آئیے ناں کسی وقت۔ ابو بھی پوچھ رہے تھے آپ کو۔

رفیق: (آزردگی سے مسکراتے ہوئے) انھیں میرا سلام کہیے گا۔۔۔ زندگی رہی تو ان شاءاللہ ضرور حاضر ہوں گا۔۔۔ لیکن ہو سکتا ہے اس وقت تک انھیں میرا نام بھی بھول چکا ہو۔۔۔

سعیدہ: کیا؟ کیا مطلب؟

سلامت: (گلے کے انداز میں) آپ ہی اس کو سمجھائیں باجی جی۔۔۔ میری تو آنڈریں جواب دے گئی ہیں بحث کر کر کے۔۔۔ استاد خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے۔

سعیدہ: (حیرت سے) کیا؟

سلامت: سامنے کھڑے ہیں، پوچھ لیں آپ۔

رفیق: ہاں اختر! سردار جہاں گیر کی موت کے بعد اب میرا اس ڈیرے کو چلانے کا کوئی جواز نہیں رہا۔

اختر: تو آپ چھوڑ دیں اسے۔کوئی اچھا۔۔۔کام کریں۔

رفیق: کروں گا، کروں گا، مگر باہر آ کر۔

سلامت: پھر وہی بات۔۔۔(اختر کو مخاطب کرتے ہوئے) دیکھو یار باؤ، اب جب کہ ہم یہ سارے غلط قسم کے کام چھوڑ رہے ہیں، شریف شہری بننے کا ارادہ کر رہے ہیں، تو کیا یہ کافی نہیں ہے؟ (اختر اثبات میں سر ہلاتا ہے) تو سمجھاؤ پھر ان کو۔
(استاد کی طرف اشارہ کرتا ہے۔)

رفیق: یہ بات نہیں ہے سلامے۔شریف آدمی بننے کے لیے مجھے وہ سارے بوجھ اپنی گردن سے اتارنے ہوں گے جو میں نے ان بارہ سالوں میں جمع کیے ہیں، سارے جرائم اور غیر قانونی کام جو میں کرتا رہا ہوں اُن کا کفارہ ادا کیے بغیر مجھے (اختر اور سعیدہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔سعیدہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔) ان لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونے کا کوئی حق نہیں۔میں کھڑا ہو ہی نہیں سکتا۔

سلامت: پر وہ کام تم نے اپنی خوشی سے تو نہیں کیے تھے۔

رفیق: (زور دیتے ہوئے) کیے تو تھے ناں۔۔۔قانون تو توڑا تھا ناں۔۔۔نقصان تو پہنچا ہے ناں لوگوں کو میری وجہ سے۔

سلامت: وہ تو ٹھیک ہے پر۔۔۔انصاف بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

رفیق: انصاف ہی کے لیے تو میں یہ سب کر رہا ہوں سلامے!

اختر: مگر استاد! سلامت بھی ٹھیک کہہ رہا ہے۔۔۔بارہ سال میں جو تم پر گزری ہے، یہ کم سزا تو نہیں۔

رفیق: نہیں اختر باؤ نہیں۔(سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے) میں ٹھیک کر رہا ہوں ناں سعیدہ بی بی؟

سعیدہ: (پریشانی میں) ہاں۔رفیق صاحب۔۔۔!

اختر: (احتجاج آمیز انداز میں) یہ کیا کہہ رہی ہو؟
(سعیدہ کوئی جواب نہیں دیتی۔)

رفیق: ضمیر پر بوجھ لے کر آزاد رہنے سے چند سال کی جیل کاٹ لینا برا سودا نہیں ہے اختر!۔۔۔(جاتے جاتے رُکتا ہے۔) پھر تم بھی کسی جھجک کے بغیر مجھے اپنا دوست کہہ سکو گے۔۔۔کہو گے ناں!۔۔۔(اختر اثبات میں سر ہلاتا ہے۔) اچھا سعیدہ بی بی! خدا حافظ!

سعیدہ: خدا حافظ!

سلامت: (بے چینی سے آگے آتے ہوئے) کمال کرتے ہو یار استاد جی۔تمھارا خیال ہے، ہمارا کوئی ضمیر نہیں ہے۔۔۔ہمارے اوپر

کوئی بوجھ نہیں۔ اگر تم نے جیل کی دال روٹی کھانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔۔۔ (سعیدہ سے) انسانیت بھی کوئی چیز ہوتی ہے۔

(دونوں جاتے ہیں۔ رفیق چند لمحے دروازے میں رُک کر سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔)

سین: ۱۵

احمد علی کا گھر: (احمد علی آہستہ آہستہ چل رہا ہے۔ سب لوگ اس کی طرف خوش نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔)

فقیر حسین: ذرا آہستہ۔ ڈاکٹر صاحب نے پچاس قدم چلنے کو کہا تھا، یہ نہیں کہا تھا کہ تیز گام کی طرح چلنا ہے۔

(سب ہنستے ہیں۔)

احمد علی: آج میں اتنا خوش ہوں کہ جی چاہتا ہے پیدل ساری دنیا میں گھوم جاؤں۔

نیلم: (شرارت آمیز انداز میں) مگر کراچی سے آگے تو سمندر شروع ہو جاتا ہے ابّو!

سلمیٰ: (محبت سے) بہت بدتمیز ہوتی جا رہی ہو تم۔

اختر: جی بالکل۔

نیلم: آپ تو مت بولا کریں بیچ میں۔

احمد علی: کیوں نہیں بولے گا یہ۔۔۔ بلکہ ہم تو ایسا انتظام کر رہے ہیں کہ تم اس کے سامنے بول ہی نہ سکو۔ کیوں سلمیٰ؟

سلمیٰ: یہ پھر بھی باز نہیں آئے گی۔

احمد علی: کیوں؟ ماں سے کچھ نہیں INHERIT کیا اس نے؟

سلمیٰ: کیا؟

احمد علی: میرا مطلب تھا تم سے کچھ نہیں سیکھا اس نے؟

سلمیٰ: اچھا۔

فقیر حسین: کیوں تم دونوں میری بیٹی کے پیچھے پڑ گئے ہو۔ ادھر آؤ بیٹی! تم میرے پاس آؤ۔

(نیلم حیرت سے سب کی طرف دیکھتی ہے۔ ایک دم ان کا مطلب سمجھ کر شرماتی ہے۔ اندر کی طرف بھاگ جاتی ہے۔

(سب ہنس پڑتے ہیں۔)

احمد علی: میرا خیال ہے، بھائی فقیر حسین، اب جب کہ اللہ نے ہم سب پر مہربانی کر دی ہے تو میں تم سے بھی کچھ مانگ ہی لوں۔

فقیر حسین: (مسکراتے ہوئے) جو مانگنا ہو سیدھی طرح مانگنا، چکر نہ دینا پہلے کی طرح۔

احمد علی: نہیں فقیر حسین! اب ایسا نہیں ہوگا۔ اب میں، خیر چھوڑو اسے۔ سعیدہ بیٹی! ذرا یہاں آنا۔

(سعیدہ چونک کر اس کی طرف دیکھتی ہے۔)

تم بھی آؤ خالد بیٹا۔

خالد: جی! (اُٹھ کر اس کے پاس بیٹھتا ہے۔)۔ یہاں آؤ بیٹی! میرے پاس۔

سعیدہ: مَیں یہیں ٹھیک ہوں چچا جان۔

احمد علی: ارے نہیں بھئی۔ تمھیں پتا نہیں مَیں تمھیں یہاں کیوں بلا رہا ہوں۔ کیوں فقیر حسین؟
(مسکرا کر اس کی طرف دیکھتا ہے۔ فقیر حسین پہلے مسکراتا ہے پھر غور سے سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔)

فقیر حسین: کیا بات ہے سعیدہ بیٹی؟

سعیدہ: (اٹکتے ہوئے) ابو! چچا جان مجھے جس لیے۔۔۔ اپنے پاس بلا رہے ہیں، مَیں۔۔۔ وہ۔۔۔ مَیں نہیں کر سکتی۔

سلمٰی: (حیرت سے) مگر بیٹی! خالد اور تم تو۔۔۔

احمد علی: ہاں بیٹی! تم دونوں تو۔۔۔

سعیدہ: اس وقت اور بات تھی چچا جان۔۔۔ مَیں۔۔۔ دراصل۔۔۔

فقیر حسین: (حیرت سے) خالد کو تو تم بہت پسند کرتی ہو بیٹی۔

سعیدہ: خالد بہت اچھے ہیں ابو! بہت اچھے، مگر آپ کہا کرتے ہیں ناں ابو کہ کسی دوسرے کے لیے کچھ کرنا ہو تو اپنے آپ کو مارنا پڑتا ہے۔ اپنے اندر سے اپنے حصّے سے کچھ کاٹ کر اُسے دینا پڑتا ہے۔

فقیر حسین: ہاں ہاں بیٹی!

سعیدہ: مَیں نے بھی یہی سوچا ہے ابو۔ ہم سب کے پاس سب کچھ ہے۔ آرام، سکون، توجہ، خوشی، محبت۔ لیکن ایک شخص ایسا ہے ابو جس کے پاس ان میں سے ایک بھی چیز نہیں۔ بالکل اکیلا ہے وہ۔

فقیر حسین: (حیرت سے) کس کی بات کر رہی ہو بیٹی؟

اختر: (چند لمحے سعیدہ کے تذبذب کو دیکھتا ہے اور ایک قدم آگے بڑھتا ہے۔) رفیق؟ تم رفیق کی بات کر رہی ہو ناں؟
(سعیدہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔) مگر سعیدہ۔۔۔ رفیق۔

سعیدہ: تم تو اسے جانتے ہو اختر! ہم سب سے زیادہ جانتے ہو۔ وہ پڑھا لکھا نہیں۔ شکل سے گنوار لگتا ہے۔ اس کا ماضی داغ دار ہے۔ مگر یہ سب کچھ اُس کی اپنی مرضی سے نہیں ہوا۔ اتنی اذیت اور تکلیف دیکھنے کے باوجود اگر کسی آدمی کے اندر انسان زندہ رہے تو اس کی مدد کرنی چاہیے اختر، حفاظت کرنی چاہیے اس کی۔

اختر: ہاں! یہ تو ٹھیک ہے۔

احمد علی: کون ہے یہ رفیق؟

عابد: ڈیڈ! یہ وہی ہے جس نے مجھے سردار جہاں گیر کی قید سے نکالا تھا۔

سلمیٰ: کیا کرتا ہے؟

عابد: مگر سعیدہ! وہ تو۔۔۔ اختر بتا رہا تھا کہ HE IS UNDER ARREST (سعیدہ اثبات میں سر ہلاتی ہے۔) تو۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔

سعیدہ: کسی اور کو ہو نہ ہو، ہمیں تو پتا ہے عابد کہ اس نے جو کچھ کیا، کیوں کیا تھا۔ اگر ایک گناہ گار توبہ کر لے، کفّارہ ادا کر دے اپنے جرموں کا، سزا بھگت لے اپنی غلطی کی، تو کیا اس کے بعد بھی معاشرہ اسے قبول نہ کرے!

احمد علی: کیوں نہیں کرے بیٹی، مگر اس کے لیے تم۔۔۔ تم کیوں؟

سعیدہ: اس لیے چچا جان کہ اس تصویر کا یہ رُخ صرف ہم لوگوں نے دیکھا ہے۔ اگر ہم اُسے معاف نہیں کر سکتے تو باقی دنیا کیسے کرے گی۔ (فقیر حسین کی طرف دیکھتی ہے۔)

میں نے ٹھیک کہا ہے ناں ابّو!

فقیر حسین: تم نے بہت اچھا سوچا ہے بیٹی، لیکن اگر تم نے اسے سہارا دینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اُسے کبھی یہ احساس نہ ہونے دینا کہ تم نے اس پر رحم کھا کر اسے قبول کیا ہے۔ احسان کے اظہار سے اس کی برکت زائل ہو جاتی ہے، بیٹی!

سعیدہ: مجھے اس کا احساس ہے ابّو! ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ (وہ روتے ہوئے باپ کے سینے سے لگتی ہے۔) مجھے شاید یہ بات اس طرح نہیں کرنی چاہیے تھی۔ ابّو! مجھے معاف کر دیجیے۔

(ڈراما: دہلیز)

مشق

ا۔ مختصر جواب دیں:

(الف) ”استاد خود کو پولیس کے حوالے کر رہا ہے۔“ متن کے مطابق یہ بات کس کردار نے کس کے بارے میں کہی؟

(ب) جب اختر نے رفیق کا نام لیا تو سعیدہ نے رفیق کے بارے میں کن جذبات کا اظہار کیا؟

(ج) ”ضمیر پر بوجھ لے کر آزاد رہنے سے چند سال کی جیل کاٹ لینا بُرا سودا نہیں۔“ اس جملے کی وضاحت سیاق و سباق کے حوالے سے کریں۔

(د) فقیر حسین نے بیٹی کو کیا نصیحت کی؟

(ہ) ڈراما دہلیز کے اہم کرداروں کا تعارف کروائیں۔

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) متن کے مطابق ڈرامے کا سب سے متحرک اور مرکزی کردار ہے:

(الف) رفیق (ب) سعیدہ (ج) خالد (د) فقیر حسین

(ii) ”دہلیز“ اصنافِ ادب کے لحاظ سے ہے:

(الف) ناول (ب) ڈراما (ج) داستان (د) افسانہ

(iii) رفیق جرم کی دنیا میں گھرا رہا:

(الف) دس سال (ب) بارہ سال (ج) چودہ سال (د) سولہ سال

(iv) رفیق نے اپنے آپ کو قانون کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا:

(الف) دوسروں کو سبق سکھانے کے لیے (ب) خود کو چھپانے کے لیے

(ج) جُرم کی دنیا سے بچنے کے لیے (د) ضمیر کا بوجھ اتارنے کے لیے

(v) بیماری سے صحت یاب ہوا:

(الف) عابد (ب) خالد (ج) اختر (د) احمد علی

(vi) ”انصاف ہی کے لیے تو مَیں یہ سب کر رہا ہوں سلامے!“ اس جملے میں ”سلامے“ اسمِ علم کے مطابق ہے:

(الف) کنیت (ب) عرف (ج) تخلص (د) خطاب

۳۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں:

(الف) اگر تم نے ــــــ کی دال روٹی کھانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں بھی تمھارے ساتھ چلوں گا۔

(ب) فقیر حسین پہلے ــــــ ہے پھر غور سے سعیدہ کی طرف دیکھتا ہے۔

(ج) رفیق چند لمحے دروازے میں رُک کر ــــــ کی طرف دیکھتا ہے۔

(د) آج مَیں اتنا خوش ہوں کہ جی چاہتا ہے پیدل ساری ــــــ میں گھوم جاؤں۔

(ہ) احسان کے ــــــ سے اس کی برکت زائل ہو جاتی ہے۔

۴۔ آپ کے نزدیک ڈراما ”دہلیز“ کا سب سے فعال کردار کون سا ہے؟ اپنی بات کی وضاحت میں دلائل دیں۔

۵۔ طلب دینی اور اخلاقی تناظر میں توبہ کی فضیلت بیان کریں۔

۶۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں:

گزشتہ ہفتے ہمارے کالج کی طرف سے تفریحی مقام کی سیر کا انعقاد کیا گیا اور سیر کا مرکز ”مری“ کی وادی اور اس کا قرب وجوار طے پایا۔

ہمارے تمام اساتذہ نے مل کر تمام انتظامات ترتیب دیے، بسوں کا انتظام کیا۔ ۳۰ رجون۔۔۔۔۔۔ ۲۰ء کو صبح ۹ بجے تک تمام طلبہ کالج میں جمع ہو کر بذریعہ کوسٹر سفر کے لیے روانہ ہو گئے۔ سفر چار گھنٹے کا تھا۔ میں نے اور میرے تمام دوستوں نے خوب مزے کیے۔ راستے میں ایک مسجد کے سامنے نمازِ ظہر ادا کرنے کے لیے کوسٹر روکی گئی۔ ہم سب نے باوضو ہو کر نماز ادا کی۔ مسجد کے قریب ہی ایک ڈھابا تھا۔ طلبہ نے وہاں سے گرما گرم پکوڑے، سموسے کھائے اور لطف اندوز ہوئے۔ کوسٹر دوبارہ منزلِ مقصود کی طرف روانہ ہوئی اور دو ڈھائی گھنٹے کی مسافت کے بعد ہم مری پہنچ گئے۔ سب سے پہلے ہمیں مری کی مال روڈ کی سیر کا موقع میسر آیا جہاں اردگرد کی دکانوں سے میں نے خشک میوہ جات کے ساتھ ساتھ اور بھی بہت سی چیزیں خریدیں۔ مال روڈ کے بعد ہم نے وادیِ مری کی معروف گلیوں کی سیر کی۔ ہم گھوڑا گلی، چھانگلہ گلی اور نتھیا گلی بھی گئے۔ یہاں کا دل کش ٹھنڈا موسم ہمیشہ یاد رہے گا۔ مری میں ہمارا قیام مال روڈ کے کنارے ایک خوب صورت ہوٹل میں تھا۔ جب ہم سیر سپاٹے سے تھک گئے تو ہوٹل کا رُخ کیا۔ ایک رات آرام کے لیے ہوٹل کے چند کمرے کرائے پر لیے گئے تھے۔ باقی دوستوں کی طرح میں بھی تھکاوٹ سے چور اپنے کمرے میں جاتے ہی لیٹ گیا اور صبح کہیں جا کے میری آنکھ کھلی۔ تمام طلبہ نے اپنے ساتھ آئے ہوئے اساتذہ کے ہمراہ ناشتا کیا۔ گیارہ بجے تک مزید سیر کا وقت مختص تھا۔ وقتِ مقررہ پر تمام لوگ ہوٹل میں اکٹھے ہوئے اور اپنا اپنا سامان باندھ کر واپسی کے لیے بار دگر بس میں سوار ہو گئے۔ اس سفر میں ہمیں اپنے اساتذہ کی قُربت بھی نصیب رہی اور تفریح کا موقع بھی میسر آیا۔ مجھے یہ تفریحی دورہ ہمیشہ یاد رہے گا۔

سوالات:

- عبارت میں کس سفر کی رُوداد بیان کی گئی ہے؟
- مال روڈ سے کس چیز کی خریداری کی گئی؟
- سیر و سیاحت کے لیے کون سی تاریخ مقرر تھی اور سفر کا آغاز کس وقت ہوا؟
- سفر کے اختتام پر طلبہ کہاں پہنچے؟
- اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

زبان شناسی:

حروف کی اقسام: اُردو میں حروف کی بہت سی اقسام ہیں، جن میں سے حرفِ بیان، حرفِ تاکید اور حرفِ علّت کے متعلق آپ پڑھ چکے ہیں۔ مزید چند ایک حروف کی اقسام درج ذیل ہیں:

حروفِ جار: وہ حروف ہیں جو اسما اور افعال کو آپس میں ملاتے ہیں۔ مثلاً: میں، سے، پر، تک، ساتھ، اوپر، نیچے، لیے، آگے، وغیرہ۔

حروفِ اضافت: وہ حروف ہیں جو اسموں کے باہمی تعلق اور ملکیت کو ظاہر کرتے ہیں۔ اُردو میں کا، کے، کی حروفِ اضافت ہیں۔

حروفِ عطف: وہ حروف ہیں جو اسموں یا جملوں کو آپس میں ملاتے ہیں۔ مثلاً: و، اور، نیز، پھر، بھی وغیرہ۔

حروفِ استفہام: وہ حروف ہیں جو کچھ پوچھنے یا سوال کرنے کے موقع پر بولے جاتے ہیں۔ مثلاً: کیا، کیوں، کہاں، کب، کون، وغیرہ۔

حروفِ تشبیہ: وہ حروف ہیں جو کسی چیز کو دوسری چیز کے مانند قرار دینے کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً: مانند، طرح، جیسا، وغیرہ۔

۷۔ کالم:الف میں سے کالم:ب کے تحت دیے ہوئے الفاظ کے مطابق حروف کی درست اقسام چن کر کالم:ج میں درج کریں:

کالم:الف	کالم:ب	کالم:ج
حرفِ جار	جیسا	
حرفِ اضافت	کہاں	
حرفِ عطف	کا	
حرفِ استفہام	اور	
حرفِ تشبیہ	پر	

۸۔ درج ذیل الفاظ پر درست اعراب لگائیں۔

آزردگی، کفارہ، سمندر، انتظام، چکمہ، اذیت

۹۔ سبق "دہلیز" کا خلاصہ تحریر کریں۔

مُکالمہ لکھنا:

مُکالمہ کے لغوی معنی ہیں کلام کرنا۔ اصطلاح میں دو یا دو سے زیادہ افراد کے مابین کسی موضوع سے متعلق گفت گو کرنے کو مُکالمہ کہتے ہیں۔ اچھا مُکالمہ وہ ہے جس میں روزمرہ بات چیت کا انداز اور بے تکلف لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہو، جو حقیقی زندگی کے قریب ہو اور اندازِ گفت گو میں مخاطب کے مقام و مرتبہ کا خیال رکھا گیا ہو۔ مُکالمہ میں تمام کردار اپنی شخصیت، اپنے خیالات و تصورات کا اظہار عمدہ گفت گو سے کرتے ہیں۔ زبان و بیان پر قدرت اور کرداروں کی سیرت اور فطرت کی واضح تصویر کشی کے لیے مُکالمے بنیادی اہمیت رکھتے ہیں۔

۱۰۔ "جدید ذرائع ابلاغ کی اہمیت" کے موضوع پر تین طلبہ کے درمیان مُکالمہ تحریر کریں اور جماعت میں پیش کریں۔

۱۱۔ طلبہ مل کر قراردادِ پاکستان کو رول پلے کے انداز میں پیش کریں۔

سرگرمی برائے طلبہ:

- تحقیقی و تنقیدی کتب کی مدد سے اُردو ڈراما کی روایت پر ایک مضمون لکھیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- ٹی وی ڈرامے کی تاریخ اور مختصر ارتقا سے آگاہ کریں۔
- ڈرامے کے بنیادی اجزا: پلاٹ، کردار، مکالمہ اور نقطۂ عروج سے آگاہ کریں۔

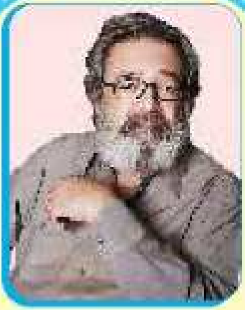

امر جلیل

(پیدائش: ۸ نومبر ۱۹۳۶ء)

امر جلیل کا اصل نام قاضی عبدالجلیل ہے۔ وہ سندھ کے شہر روہڑی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کراچی اور پھر نواب شاہ سے بی۔ اے کا امتحان پاس کرنے کے بعد کراچی یونیورسٹی سے اکنامکس اور تاریخ کے مضامین میں ماسٹرز کیے۔ سندھی اور انگریزی زبان میں افسانے، ڈرامے، مضامین اور کالم لکھ کر شہرت حاصل کی۔ اب تک ان کی بیس کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔

امر جلیل نے اپنی کہانیوں میں معاشرتی ناہمواریوں کی نشان دہی کی ہے۔ انھوں نے زمینداروں، وڈیروں اور جعلی پیروں کو افسانوی انداز میں پیش کیا۔ امر جلیل نے ہمیشہ جمہوریت کے حق میں اور آمریت کے خلاف لکھا۔ سندھی زبان میں ان کے متعدد ناول اور افسانے چھپ چکے ہیں۔ ان کی تحریروں کے تراجم مختلف زبانوں میں کیے گئے ہیں۔

ان کے افسانوی مجموعوں میں ”دل جی دنیا“، ”جدھن مان نہ ھوندس“، ”تاریخ کا کفن“ وغیرہ شامل ہیں۔ وہ بہت سے پاکستانی اور عالمی اعزازات اپنے نام کر چکے ہیں جن میں پرائیڈ آف پرفارمنس ایوارڈ اور کمالِ فن ایوارڈ شامل ہیں۔

امر جلیل کو بچپن ہی سے لکھنے لکھانے کا شوق تھا۔ انھوں نے پہلی کتاب اس وقت لکھی جب ان کی عمر فقط دس سال تھی۔ اس کے علاوہ انھیں کرکٹ کھیلنے کا بڑا شوق تھا۔ چناں چہ وہ ایک عرصہ تک مقامی سطح پر فرسٹ کلاس کرکٹ میں بطور بیٹس مین اور وکٹ کیپر کھیلتے رہے۔

امر جلیل نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی کا آغاز ریڈیو پاکستان کراچی سے کیا جہاں سے ان کا تبادلہ اسلام آباد ہو گیا۔ اسلام آباد میں انھوں نے ملازمت کے علاوہ مختلف تعلیمی اداروں میں کام کیا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد مستقل طور پر کراچی شفٹ ہو گئے مگر پڑھنے لکھنے کا شوق بدستور جاری رہا۔

امر جلیل نہایت محنتی شخص ہیں۔ انھوں نے اپنی ضعیف العمری کا کبھی خیال نہیں کیا اور آج کل بھی پاکستان کے مختلف اخباروں بالخصوص ”ڈان“ اور ”دی نیشن“ میں حالاتِ حاضرہ پر کالم لکھتے ہیں، اس کے علاوہ سندھ ٹیلی ویژن پر بطور اینکر پرسن بھی کام کرتے ہیں۔

شاملِ نصاب افسانہ ”تاریخ کا کفن“ میں امر جلیل نے سماج میں پائی جانے والی طبقاتی تقسیم کا نقشہ کھینچا ہے۔

یہ افسانہ سندھی زبان سے اُردو میں ترجمہ ہوا ہے۔ اس کے مترجم تنگر چنا سندھ کے ممتاز دانش ور، شاعر، ترقی پسند ادیب اور باکمال ترجمہ نگار ہیں اُنھوں نے اُردو، پشتو، سرائیکی اور سندھی ادب کے شہ پارے ترجمہ کر کے قارئین تک پہنچائے ہیں۔

سبق:11

تاریخ کا کفن

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو فنِ افسانہ نگاری اور فنِ ترجمہ نگاری سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو امر جلیل کی علمی، ادبی اور صحافتی خدمات بالخصوص سندھی ادب سے روشناس کرانا۔
- طلبہ پر طبقاتی نظام کی بدصورتی کو آشکار کرنا۔
- طلبہ کے دلوں میں افلاس اور غربت کے مارے لوگوں کی مدد اور احترام کرنے کا جذبہ پیدا کرنا۔
- طلبہ کو باور کرانا کہ علاقائی ادب کے مطالعہ سے قومی وحدت کو استحکام اور پاکستانی ثقافت میں دل کشی پیدا ہوتی ہے۔

عید نماز شروع ہونے سے کچھ دیر پہلے ایک کالا کلوٹا شیدی، جس کے بال خشک، آنکھیں بنجر، بدن نحیف و نزار اور جس نے کپڑوں کے نام پر چیتھڑے پہنے ہوئے تھے؛ وہ نمازیوں کی آخری صف سے اُٹھ کھڑا ہوا۔ وہ ادھیڑ عمر کا طویل قامت شخص تھا۔ اس کے کندھے صلیب کی طرح سیدھے اور سینہ چوڑا تھا۔ اس کی پشت زندگی کا بوجھ اُٹھاتے، برداشت کرتے کمان بن چکی تھی۔ اس نے لمبی سانس کھینچ کر ایک اُڑتی نگاہ عید گاہ پر ڈالی۔

پوری عید گاہ کراچی کے بھانت بھانت کے لوگوں سے اَٹی پڑی تھی۔ قطاریں شمار سے باہر، نمازی بے انداز! کچھ کے کپڑوں کے جوڑے نئے، کچھ کے دُھلے ہوئے، کچھ کے اُجلے! رنگ اتنے سارے کہ جیسے آسمان سے رنگوں کی دھنک زمین پر اتر آئی ہو۔ عید نماز شروع ہونے میں چند لمحات باقی تھے۔ مولوی صاحب بے حد عقیدت اور بڑے جوش و خروش کے ساتھ تاریخِ اسلامی کے اوراق پلٹ رہے تھے۔ وہ کبھی بانہیں اوپر اٹھا کر تو کبھی نیچے کر کے، آواز کے زیر و بم کے ساتھ، کبھی سیدھے سُبھاؤ تو کبھی نثر میں بولتے ہوئے؛ لوگوں کے جذبۂ ایمانی کو بیدار کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ لوگ مؤدب بیٹھے ہوئے تھے اور دورانِ وعظ کبھی کبھار اونگھ بھی لیتے تھے۔ ان کی نگاہیں اپنے اپنے مُصلّوں کے آگے رکھے جُوتوں پر تھیں۔ کچھ جُوتے نئے، کچھ پُرانے اور پھٹے ہوئے تھے۔ بُوٹوں، سلیپروں، سینڈلوں اور چپلوں کے تلوے تلووں سے ملے ہوئے تھے اور جائے سجدہ سے اِنچ بھر دُور رکھے ہوئے تھے۔ جو نمازی اپنے ساتھ سجے سنورے بچے لے آئے تھے، ان کی ایک آنکھ جُوتوں میں تو ایک بچوں میں گڑی ہوئی تھی۔ صحت مند مولوی صاحب، صحت مند آواز میں وعظ کر رہے تھے اور لوگوں کو اللہ تعالیٰ کے رحم و کرم کے بجائے اللہ تعالیٰ کے قہر اور عذابِ قبر کی باتیں بتا بتا کر ڈرا رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ جوشِ ایمانی میں لاؤڈ سپیکر پھاڑ ڈالیں گے۔

"اَبے بیٹھ جا!" کنگال قسم کے ایک دُبلے پتلے شخص نے شیدی کا بازو پکڑتے ہوئے کہا، "کھڑے کیوں ہو؟ بندریا بھاگ گئی ہے کیا؟"

شیدی نے اسے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ جھٹکا دے کر، بازو چھڑا کر پچھلی صف سے نکل کر اگلی صف میں کھڑا ہو گیا۔

"اَبے! دُور کر یہ اپنے توے جیسے پاؤں۔ شیدی کو کُہنی مارتے ہوئے ایک چڑ چڑے نوجوان نے کہا: "آدمی ہو کہ تارکول!"

شیدی نے اسے کوئی جواب نہیں دیا اور نہ ہی گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ وہ اس قطار سے نکل کر اگلی قطار میں کھڑا ہو گیا۔

"اوہو۔۔۔ بڑے احمق ہو تم بھی۔" اُجلے سفید کپڑوں والے ایک شخص نے غصّے میں شیدی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "شرم نہیں آئی میرے کورے پاجامے کے پائنچے پر پاؤں رکھتے ہوئے۔"

شیدی کی اُداس آنکھوں میں پُر اسرار روشنی اُبھر آئی تھی۔ اس نے اس بپھرے ہوئے شخص کے جملے کو سُنا اَن سُنا کر دیا۔ وہ قدم بڑھا کر اگلی قطار میں جا کھڑا ہوا۔

"خبردار!" فرشتوں جیسے ایک شخص نے شیدی کی ٹانگ کی چٹکی کاٹتے ہوئے کہا: "لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ! میرا دھُلا مُصلّیٰ میلا کر دیا۔ آدمی ہو کہ ابنِ ابلیس!"

شیدی نے چٹکی کی پروا نہیں کی اور نہ ہی فرشتوں ایسے شخص کے جملے کی۔ اس کی اداس آنکھوں میں پُر اسرار روشنی بڑھتی چلی گئی۔ وہ قدم بڑھا کر اگلی قطار میں جا کر کھڑا ہو گیا۔

"ارے او بَن مانس!" ایک نوجوان، جس نے بڑی محنت اور جاں فشانی کے بعد اپنی چمکتی پیشانی پر بال سجا رکھے تھے، نے شیدی کو حقارت آمیز لہجہ میں کہا: "چڑیا گھر سے پنجرہ توڑ کر بھاگے ہو کیا؟"

قریب بیٹھے کچھ ایکٹر چھاپ نوجوانوں نے قہقہہ لگایا۔ ایک بھینگے نوجوان نے اداکاروں جیسے لہجے میں کہا: "لگتا ہے کہ افریقہ سے ہجرت کر کے آیا ہے۔"

ایکٹر چھاپ نوجوانوں کی ٹولی نے قہقہہ لگایا۔

ایک ادھیڑ عمر شخص، جو اونگھ رہا تھا، قہقہہ سن کر بیدار ہو گیا۔ اس نے گھٹنوں سے سر نکال کر نوجوانوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا: "اے لڑکو! تیس مار خانی مت دکھاؤ، وعظ سننے دو۔"

"چُپ کر، ابابیل کے بچّے!" ایک نوجوان نے فی البدیہہ جواب دیا۔ وہ شخص اُترا ہوا چہرہ لے کر بیٹھ گیا۔

اس دوران شیدی وہ قطار چھوڑ کر اگلی قطار میں جا کھڑا ہوا۔

"ارے اِدھر آگے کہاں آ رہے ہو؟" چار پانچ آدمیوں نے اسے روک لیا۔ انھوں نے اس کے پھٹے پرانے کپڑوں اور ناتواں بدن کو دیکھ کر کہا: "یہاں شیرینی بٹ رہی ہے کیا؟"

شیدی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس کی آنکھیں اگلی قطار پر گڑی ہوئی تھیں۔

"پیچھے جاؤ، اے تَوے کے بھائی! پیچھے جاؤ۔"

"دُور ہٹو۔"

"بھاگ جاؤ۔"

"خبردار جو آگے آئے!"

شیدی نے انھیں جواب نہیں دیا، نہ ہی گردن موڑ کر ان کی طرف دیکھا۔ پُراسرار روشنی واضح طور پر اس کی آنکھوں میں چمک رہی تھی۔ وہ آگے بڑھ گیا۔ وہ قدم اٹھاتا، چھلانگیں مارتا، نمازیوں کی دو چار قطاریں پھلانگ گیا۔

لوگوں میں کھلبلی مچ گئی۔ جو اونگھ رہے تھے وہ بیدار ہو کر بیٹھ گئے۔ جو بیدار تھے اور کانوں سے وعظ سن رہے تھے اور آنکھوں سے اپنے جوتوں اور بچوں کی نگہداشت کر رہے تھے، وہ شتر مرغ کی طرح گردنیں پھیر کر شیدی کی طرف دیکھنے لگے۔ انھوں نے جب شور سنا تو جھپٹ کر اپنے اپنے جوتے اٹھالیے اور بچوں کو کھینچ کر گود میں بٹھالیا۔

کچھ پُرحشمت، بہادروں اور نڈروں نے شیدی کو قابو میں کر لیا۔

"پکڑنا۔"

"مت چھوڑنا۔"

"خوب مرمت کرنا۔"

شور و غل بڑھ گیا۔ مولوی صاحب نے وعظ بند کر دیا اور منبر کے سب سے اونچے زینے پر چڑھ کر تماشا دیکھنے لگے۔ تمام خلق کا دھیان شیدی کی طرف ہو گیا۔

کئی انواع کے لوگ، کئی اقسام کے لہجے، بھانت بھانت کی بولیاں۔۔۔ لیکن مفہوم سب کا ایک جیسا۔۔۔

"چور ہے۔"

"چور نہیں ہے، جیب کترا ہے۔"

"برابر، برابر۔"

"ضرور کسی مومن کی جیب خالی کر لی ہوگی۔"

"شکل سے ہی چور کا پتر دکھائی پڑتا ہے۔"

"جوتوں کا چور ہے۔"

"قابو کرنا۔"

"پکڑنا۔"

"بھاگنے مت دینا۔"

"جلدی کرنا۔"

"چور ہے۔"

"جیب کترا ہے۔"

"بدمعاش ہے۔"

"ٹھگ ہے۔"

ایک شخص ہجوم سے راستہ بناتا، ہانپتا، بولتا، آگے بڑھ آیا۔ اس کے ہونٹ پتلے اور خشک، آنکھیں بے رونق اور بال اُجڑے ہوئے تھے۔
اس نے لوگوں سے بلند آواز میں کہا: ''میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ یہ چور نہیں نہ ہی جیب کترا اور نہ ہی لفنگا ہے۔ یہ صرف شیدی ہے۔''
جس نیک بندے کا ہاتھ شیدی کی گردن میں تھا، اس نے ایک نگاہ میں نووارد کا جائزہ لیتے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا: ''اور تم کون ہو؟''
اس نے جواب دیا: ''میں ماموں خاں موچی ہوں۔''
''بھاگ جا، موچی! اُٹھو جا کر پھٹے پرانے جوتوں کی مرمت کر۔'' نیک صورت اور نیک سیرت شخص نے کہا: ''ہم خود ہی اس کی خبر لیں گے۔''
ماموں خاں موچی دھکے ٹھڈے کھا کر منظر سے غائب ہو گیا۔
اور پھر بڑی دیر تک بلند آواز میں جملے ایک دوسرے سے اُلجھتے رہے۔۔۔

''مارو، مارو۔''

''ٹھکائی اچھی طرح کرو۔''

''پہلے اس کی تلاشی لو۔''

''نماز میں رخنہ مت ڈالو۔''

''درخت سے باندھ دو۔''

''نماز کے بعد منھ کالا کر کے، گدھے پر بٹھا کر اس کا جلوس نکالا جائے گا۔''

''ٹھیک ہے، یہ بہت بڑا اور اہم مسئلہ ہے۔''

''اس کے منھ پر کالک کے بجائے چونے کی سفیدی پھیریں گے۔''

''ہرگز نہیں، چور کا منھ ہمیشہ کالا ہوتا ہے۔''

''اس مسئلہ پر لوگوں سے ووٹ لیا جائے۔''

''ووٹ لینے کا وقت نہیں ہے۔''

لوگ آپس میں بحث مباحثہ کرنے لگے۔ وہ ایک دوسرے سے لڑنے مرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ شور و غل بڑھ گیا۔ لوگ شیدی کے حشر کے متعلق کسی ایک فیصلہ پر نہیں پہنچ سکے۔
پہلی قطار میں ملک کی نامی گرامی اور جانی پہچانی شخصیت، ہر دل عزیز، مشہور و معروف جناب محمود صاحب موجود تھے۔ لوگوں کو محمود صاحب کی حفاظت کی فکر لاحق ہو گئی۔ وہ محمود صاحب کے لیے پریشان ہونے لگے۔ ہجوم میں سے کسی نے بلند آواز، چیختے ہوئے کہا: ''کالا شیدی پہلی قطار کی طرف بڑھ رہا ہے۔ یہ بدبخت ضرور کسی دشمن ملک کا ایجنٹ ہے، اور محمود صاحب کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''
اس نئے انکشاف پر لوگ حواس باختہ ہو گئے۔
اچانک شیدی نے چھلانگ لگائی۔ وہ چیتے کی طرح چھال (چھلانگ) مارتا، بڑے بڑے ڈگ بھرتا، لوگوں، مصلّوں، جوتوں اور چپلوں کی کئی قطاریں پھلانگ گیا۔

پہلی صف میں محمود کے ساتھ شہر کے لائق افسران، صنعت کار، تاجر اور بینکر کندھے سے کندھا ملا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ گردنیں جھکائے اور دوزانو بیٹھے ہوئے تھے اور اخباری فوٹو گرافروں سے تصاویر کھنچوا رہے تھے۔ پہلی صف کے عین عقب میں، محمود صاحب کی حفاظت کے لیے سادہ کپڑوں میں حفاظتی عملہ کے مستعد اور طاقت ور ارکان بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ بہ ظاہر نماز پڑھنے اور اللہ کی عظمت کے سامنے سر بہ سجود ہونے آئے تھے، لیکن دراصل وہ محمود صاحب کی حفاظت کے لیے وہاں موجود تھے، اور نئی صورتِ حال کے باعث چوکس ہو رہے تھے۔ ان کے نیفوں میں خطرناک اسلحہ چھپا ہوا تھا، اس لیے وہ بیٹھنے میں دشواری محسوس کر رہے تھے۔

شیدی جب اچھلتا، چھلانگیں مارتا، دوسری صف پھلانگ کر پہلی صف کی طرف بڑھنے لگا تب اسے حفاظتی عملہ کے عقابوں نے جھپٹ کر قابو کر لیا۔ وہ پلک جھپکنے میں ہی اسے لاتیں، ٹھڈے، مکے اور گھونسے مارتے، عیدگاہ سے باہر لے گئے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔

لاؤڈ سپیکروں سے مولوی صاحب کی آواز گونجنے لگی۔ وہ دونوں ہاتھ عرش کی طرف اٹھا کر، عاجزی، انکساری کے ساتھ اور مترنم انداز میں اللہ تعالیٰ سے محمود صاحب کی درازیٔ عمر کی دعا مانگنے لگے۔

لوگوں کا خیال بدل گیا۔ وہ شیدی کو بھول کر پہلے محمود صاحب کی طویل عمری کی دعائیں اور پھر وعظ سننے لگے۔ انھوں نے اپنے نئے پرانے بوٹ اور چپل سجدہ گاہ سے انچ بھر کی دوری پر رکھے تھے۔

عیدگاہ سے باہر ایک علیحدہ جگہ میں حفاظتی عملہ کے ایک بڑے افسر نے بید کی چھڑی کے پے در پے وار کرتے ہوئے شیدی سے پوچھا، ''بتاؤ، جواب دو۔ تم کس نیت سے پہلی صف کی طرف بڑھ رہے تھے؟''

مکوں، گھونسوں اور تھپڑوں کے سبب شیدی کا پورا چہرہ خوم خون ہو گیا تھا۔ اس کا منھ خون سے بھرا ہوا تھا۔ وہ کوئی بھی جواب نہ دے سکا۔

''جواب دو۔'' پھر لاتیں اور مکے، چہرے پر گھونسے اور پنڈلیوں پر لانگ بوٹوں کی ٹھوکریں لگیں، ''جواب دو، کس کے ایجنٹ ہو؟ کس نیت سے آگے بڑھ رہے تھے؟''

شیدی کی ناک سے خون کے ریلے بہنے لگے۔ پیٹ اور کوکھ اور پسلیوں پر لاتیں پڑنے کے باعث اس کا جوڑ جوڑ اُکھڑ گیا۔ اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔

''پہلی قطار کی طرف کیوں اور کس نیت سے بڑھ رہے تھے؟'' عمل دار نے اسے پیٹ پر لات اور گردن پر مکا مارتے ہوئے پوچھا، ''جواب دو، کس ارادے سے پہلی صف کی طرف بڑھ رہے تھے؟''

شیدی نے خون کی کلی کر کے، منھ کو پھٹی قمیص کے بازو سے پونچھ لیا۔ اس کے کٹے پھٹے ہونٹ کانپنے لگے۔ اس نے کمزور آواز میں کہا: ''میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔''

حفاظتی عملہ کے چاق چوبند جوان شیدی کا جواب سن کر کچھ کچھ پریشان ہو گئے۔ پھر، اس کے خراب حال اور سادہ شکل و صورت دیکھ کر قہقہے لگانے لگے۔ کسی نے کہا: ''ارے، تم پہلی قطار میں کھڑے ہو کر نماز پڑھو گے؟''

ان میں سے ایک نے زوردار مکا شیدی کی پیشانی پر ناک کے قریب جمایا اور کہا: ''تم جھوٹ بولتے ہو۔''

پورا ماحول شیدی کی نگاہوں کے سامنے زیر و زبر ہونے لگا۔ اس کی سانس سینہ میں دھڑکنے کے بجائے تڑپنے لگی۔ سانس بند ہونے

گی۔ ناک، منھ اور کانوں سے خون رستا، بہتا رہا۔ اس نے شکستہ لہجے میں کہا: ’’میں پہلی قطار میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔‘‘

حفاظتی عملہ کے ایک تومند نوجوان نے شیدی کے سینے پر گھونسے کا بھرپور وار کیا اور پھر اسے گالی دیتے ہوئے کہا: ’’ڈراما کرتے ہو، سُؤر کے بچے! ہم تمھیں پہچان گئے ہیں۔ تم غیر ملکی ایجنٹ ہو۔‘‘

شیدی مُکّا کھا کر پیچھے ہٹ گیا، جا کر دیوار سے لگا۔

’’بتاؤ!‘‘ پھر لاٹھیاں برسنے لگیں: ’’بتاؤ، کس کے ایجنٹ ہو؟‘‘

’’میں ایجنٹ نہیں ہوں۔‘‘ شیدی بجھنے لگا، اس نے ٹوٹتے بکھرتے ہوئے کہا: ’’میں پہلی صف میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔‘‘

’’اَبے لنگور!‘‘ ایک موٹے تگڑے اہلکار نے اسے تھپڑ مارتے ہوئے کہا، ’’زندگی بھر کبھی آئینہ دیکھا ہے! چلا ہے پٹھ پہلی قطار میں نماز پڑھنے!‘‘

شیدی کی سانسوں کا سلسلہ اس کی ناک سے بہتے خون کے سبب ٹوٹنے لگا۔ اس نے کہا: ’’میں پہلی قطار میں کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔‘‘

’’ابے اونٹ کے بچے!‘‘ موٹے تگڑے عمل دار نے کہا، ’’شہر کے معزز لوگ محمود صاحب کے ساتھ نماز پڑھنے کے لیے پہلی صف میں موجود ہیں۔ تم پہلی صف میں کیسے نماز پڑھو گے؟‘‘

شیدی نے نحیف آواز میں کہا: ’’میں بھی پہلی صف میں محمود صاحب کے ساتھ کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا۔‘‘

حفاظتی عملہ کے تنخواہ داروں نے خوب قہقہے لگائے۔ ایک نے کہا: ’’اس کا دماغ ٹھکانے نہیں ہے۔‘‘

’’بہروپیا ہے۔‘‘ بڑے افسر نے اپنے عملے کو حکم دیتے ہوئے کہا: ’’اس سے پوچھو کہ یہ کون ہے اور محمود صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کا ڈھونگ کیوں کر رہا ہے؟‘‘

پھر جو درگت بنانا ان کے حافظہ میں محفوظ تھا، وہ درگت انھوں نے شیدی کی بنائی۔ لاتیں، مُکّے اور گھونسے مار مار کر اسے اَدھ مُوا کر دیا۔ شیدی فرش گزیں ہو گیا۔ انھوں نے اسے پھر اٹھا کر کھڑا کر دیا۔ اس کے منھ پر پانی کے چھینٹے مار کر اسے ہوش میں لے آئے۔ شیدی نے خون آلود آنکھیں کھول کر حفاظتی عملہ کی طرف دیکھا۔

چاق چوبند افسر نے اس کے بالوں کو مٹھی میں پکڑتے ہوئے کہا: ’’بتاؤ، تم کون ہو؟ محمود صاحب کے ساتھ کھڑے ہو کر نماز کیوں پڑھنا چاہتے ہو؟‘‘

شیدی بجھنے لگا۔ ایک لمحہ کے لیے اس کی آنکھوں میں پُراسرار روشنی لوٹ آئی۔ اس نے ٹوٹے پھوٹے لہجے میں کہا: ’’میں ایاز ہوں۔ میں ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔‘‘

(تاریخ کا کفن)

(سندھی سے اردو ترجمہ: بنگر چنا)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) افسانہ نگار نے شیدی کا تعارف کن الفاظ میں بیان کیا ہے؟

(ب) عید گاہ کا منظر بیان کریں۔

(ج) شیدی کی حمایت کس نے کی اور اس پر لوگوں کا ردِعمل کیا تھا؟

(د) پہلی صف میں کون لوگ تشریف فرما تھے؟

(ہ) حفاظتی عملے نے شیدی کے ساتھ کیسا سلوک کیا؟

(و) ''میں ایاز ہوں۔ میں ایک ہی صف میں کھڑا ہو کر محمود کے ساتھ نماز پڑھوں گا۔'' یہ جملہ علامہ اقبالؒ کے کس شعر کی طرف اشارہ کرتا ہے؟

(ز) زیرِ مطالعہ سندھی افسانہ کا ترجمہ اُردو زبان میں کس نے کیا؟

۲۔ متن کو مدِنظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں:

(الف) شیدی کی اُداس آنکھوں میں پُراسرار ____ اُبھر آئی تھی۔

(ب) فرشتوں جیسے ایک شخص نے شیدی کی ٹانگ کی چٹکی کاٹتے ہوئے کہا، ''لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّۃَ! میرا ____ کا مُصلّٰی میلا کر دیا۔

(ج) ماموں خاں موچی دھکے ٹھڈے کھا کر ____ سے غائب ہو گیا۔

(د) بدبخت ضرور کسی دشمن ملک کا ____ ہے اور محمود صاحب کو قتل کرنے کے لیے بھیجا گیا ہے۔

(ہ) پورا ماحول شیدی کی نگاہوں کے سامنے ____ ہونے لگا۔

۳۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں۔

عہدِ حاضر کا انسان انٹرنیٹ، سمارٹ فونز، کمپیوٹر، ٹیبلٹ اور لیپ ٹاپ کے ذریعے سے پوری دنیا سے جُڑا ہوا ہے۔ دنیا بھر کی معلومات تک اس کی رسائی ممکن ہو چکی ہے۔ وہ پرنٹ میڈیا (Print Media) سے ہاٹ میڈیا (Hot Media) کی طرف رغبت اختیار کر چکا ہے۔ سچ اور جھوٹ سے آلودہ معلومات سوشل میڈیا پر جنگل میں لگی آگ کی طرح پھیل جاتی ہیں۔ اس صورتِ حال میں معلومات کی حقیقت کو جانچنے کے لیے میڈیا انفارمیشن لٹریسی (MIL) وقت کی اہم ضرورت ہے۔ اس کی مدد سے تنقیدی سوچ کی مہارت کو فروغ دے کر معلومات کی جانچ پڑتال اور اس کا تنقیدی جائزہ لیا جا سکتا ہے۔ اگر ہم اپنے نوجوانوں کی تنقیدی سوچ اور بامقصد زندگی کو فروغ دینے کی خواہش رکھتے ہیں تو ان میں غلط خبروں کے بارے میں شعور بیدار کرنا، جعلی خبروں کو بغیر تصدیق کے پھیلانے سے روکنا ہوگا۔ غلط اطلاعات و معلومات معاشرے کے لیے مُضر نتائج کا باعث اور رائے عامہ پر منفی اثر ڈال سکتی ہیں۔ میڈیا انفارمیشن لٹریسی درحقیقت میڈیا اور معلومات تک مؤثر طریقے سے رسائی کا نام ہے۔ اس کے ذریعے معاشرے میں متنوع نقطۂ نظر کی حوصلہ افزائی، ثقافتی تفہیم اور احترام کو فروغ دیا جا سکتا ہے۔ یورپی اور دیگر

ترقی یافتہ ممالک میں میڈیا انفارمیشن لٹریسی کو باقاعدہ تعلیمی نصاب میں شامل کیا گیا ہے تاکہ اس بات کا جائزہ لیا جا سکے کہ بچوں میں میڈیا پیغامات کو ڈی کوڈ کرنے اور ڈیجیٹل میڈیا کو ابتدائی اور مؤثر طریقے سے استعمال کرنے کی اہلیت پیدا کی جا چکی ہے۔ ان ممالک میں سکول، کالج اور یونیورسٹی سطح کے نصابات میں اسے بطور مضمون شامل کرنے کے علاوہ میڈیا انفارمیشن لٹریسی کے متعدد منصوبوں کے ذریعے عام شہریوں کو بہتر انداز میں ڈیجیٹل اور سوشل میڈیا کو استعمال کرنے کے بارے میں آگاہی دی جا رہی ہے۔

سوالات:

- عہدِ حاضر کا انسان کن نئی ایجادات سے جڑا ہوا ہے؟
- میڈیا انفارمیشن لٹریسی کے بغیر سوشل میڈیا کے منفی پہلو کون کون سے ہیں؟
- "MIL" کن انگریزی الفاظ کا مخفف ہے؟
- جعلی خبروں کو پھیلنے سے کیسے روکا جا سکتا ہے؟
- ترقی یافتہ ممالک میں میڈیا انفارمیشن لٹریسی کی کیا صورتِ حال ہے؟
- اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

۴۔ درج ذیل محاورات کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

چودہ طبق روشن ہونا، کندھا دینا، وارے نیارے ہونا، ہاتھ پسارنا،
مزہ دوبالا ہونا، بے دم ہو جانا، لبوں پر مسکراہٹ کھیلنا

۵۔ درج ذیل الفاظ پر درست اعراب لگائیں:

صلیب، مصلی، قہقہہ، نشست، ارتکاب

۶۔ سبق "تاریخ کا کفن" کا خلاصہ تحریر کیجیے۔

تلخیص نگاری

کسی عبارت کو کم از کم الفاظ میں اس طرح لکھنا کہ اس عبارت کا تاثر برقرار رہے اور کوئی بات محلِ نظر نہ ہو، تلخیص نگاری کہلاتی ہے۔ تلخیص اصل عبارت کی عموماً ایک تہائی ہوتی ہے مگر عبارت کے اصل نکات ضرور درج کیے جاتے ہیں۔ تلخیص جامع پیراگراف کی صورت میں لکھتے ہیں۔ غیر ضروری تراکیب، مترادفات، تشبیہات سے گریز کیا جاتا ہے۔

۷۔ درج ذیل عبارت کی تلخیص لکھیں جو متن کا ایک تہائی ہو، موزوں عنوان بھی تجویز کریں:

درختوں کی بہتات ہوا میں موجود آبی بخارات میں اضافے کا باعث بنتی ہے اور بارش کے ذریعے سے فضائی آلودگی کو کم کرنے میں

اہم کردار انجام دیتی ہے۔اس کے علاوہ درختوں کی وجہ سے زمینی اور صوتی آلودگی بھی کم ہوتی ہے۔وہ علاقے جہاں سیم اور تھور زیادہ ہو، وہاں درخت زمین سے پانی جذب کر کے زیرِ زمین کھاری پانی کی مقدار کو کم کر دیتے ہیں۔اس طرح پانی کی سطح نیچے چلی جاتی ہے اور زمین قابلِ کاشت بن جاتی ہے۔پھل دار درخت اور پھول دار پودے مناظرِ فطرت کو پرکشش بناتے ہیں۔سبزہ مال مویشیوں کی خوراک بنتا ہے۔درختوں کی وجہ سے فرنیچر، ریشم اور گتہ سازی جیسی صنعتیں فروغ پاتی ہیں۔درخت نہ صرف ہمارے بہترین دوست ہیں بلکہ ان پر بے شمار پرندے گھونسلے بناتے، پرورش پاتے اور چہچہاتے ہیں، اس لیے انھیں بلاوجہ ان کی تذ نہیں کرنا چاہیے۔

سرگرمی برائے طلبہ:

- سبق "تاریخ کا کفن" کے متن کو غور سے پڑھتے ہوئے مترادف الفاظ کی تراکیب کی نشان دہی کریں اور کاپی پر لکھیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- اساتذہ معاشرے میں پائی جانے والی طبقاتی تفریق کی نشان دہی کریں۔
- علاقائی ادب کی اہمیت بیان کریں اور اس کی نمایاں خصوصیات بتائیں۔
- طلبہ پر قومی اور ملی وحدت کی اہمیت واضح کریں۔

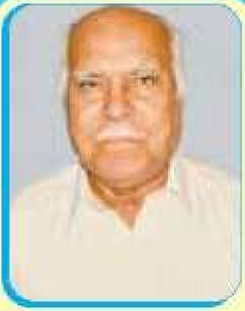

ڈاکٹر ممتاز منگلوری

(۱۹۳۷ء۔۲۰۱۱ء)

ڈاکٹر ممتاز منگلوری تحصیل و ضلع مانسہرہ کے ایک گاؤں منگلور میں پیدا ہوئے۔شیروان ہائی سکول سے میٹرک اور گورنمنٹ کالج ایبٹ آباد سے بی۔اے کیا۔پشاور یونیورسٹی سے آنرز اور پنجاب یونیورسٹی سے ایم۔اے کے امتحانات پاس کیے۔ ۱۹۶۲ء میں پنجاب یونیورسٹی، لاہور میں لیکچرر مقرر ہوئے۔اسی دوران میں مغربی پاکستان اُردو اکیڈمی، لاہور میں ریسرچ آفیسر کے طور پر بھی کام کیا۔ ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔۱۹۶۸ء میں مغربی پاکستان ٹیکسٹ بک بورڈ میں سبجیکٹ سپیشلسٹ تعینات ہوئے۔۱۹۷۱ء میں NWFP ٹیکسٹ بک بورڈ پشاور میں تعیناتی ہوگئی۔ ۱۹۹۷ء میں ملازمت سے سبکدوش ہوئے تو عالمی بینک کے ناردرن ایجوکیشن پراجیکٹ آزاد جموں و کشمیر میں کنسلٹنٹ کے طور پر فرائض انجام دیے۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری اردو کے معروف مصنف، معلم اور پرنسپل پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج ڈاکٹر سید عبداللہ کے ہم وطن ہونے کے ناتے ان کے بہت قریب تھے اور انھی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اردو کی ترویج و اشاعت میں ہمیشہ پیش پیش رہے۔انھوں نے اپنی ذاتی کاوش سے منگلور میں ایک لائبریری قائم کی اور وصیت کی کہ ہزارہ یونیورسٹی میں جب بھی اُردو کا شعبہ قائم ہو تو میری لائبریری کی تمام کتابیں شعبۂ اُردو کو دے دی جائیں کیوں کہ اس ذخیرۂ کتب میں صرف اردو زبان و ادب کی کتابیں ہی جمع کی گئی ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری نے عبدالحلیم شرر کے ناول "ملک العزیز ورجنا" کا متن مرتب کیا اور حواشی کے علاوہ ایک تنقیدی مقدمہ بھی تحریر کیا۔اس کے علاوہ انھوں نے "فردوسِ بریں" اور "اِندر سبھا" وغیرہ جیسے ناولوں اور ڈراموں کو ترتیب دینے کے ساتھ ساتھ ان کے مبسوط مقدمے بھی لکھے۔

ڈاکٹر ممتاز منگلوری کی مرتبہ کتب میں "لطیفِ نثر" اور "لطیفِ غزل" کے علاوہ "پاکستان میں اُردو کے سرکاری قاعدے"، "ڈاکٹر سید عبداللہ کی اُردو خدمات"، "شرر کے تاریخی ناول اور ان کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ"، "متاعِ لوح و قلم"، "متاعِ نقد و نظر" اور "مختصر تاریخ زبان و ادب ہند کو" وغیرہ شامل ہیں۔

سبق: ۱۲

پاکستانی زبانیں اور ان کا باہمی رشتہ

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو اُردو زبان کی مختصر تاریخ سے رُوشناس کرانا۔
- اُردو زبان کے لسانیاتی پہلوؤں پر روشنی ڈالنا۔
- طلبہ کو اُردو زبان کی وسعت اور مختلف زبانوں، بولیوں کے الفاظ کو اپنے اندر سمونے کی صلاحیت کی مثالیں دینا۔
- طلبہ کو یہ حقیقت ذہن نشین کرانا کہ اُردو نہ صرف بین الصوبائی رابطے کی زبان ہے بلکہ وطنِ عزیز پاکستان کی اساس بھی ہے۔

پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں۔ ان میں وطنِ عزیز کے چاروں صوبوں میں بولی جانے والی زبانوں کے علاوہ شمالی علاقوں اور آزاد کشمیر کی زبانیں بھی شامل ہیں۔ یہ زبانیں اپنے اپنے علاقوں کے عوام کی امنگوں، آرزوؤں، جذبات، احساسات اور طریق تمدن و معاشرت کی آئینہ دار ہیں۔ ان میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ذخیرہ موجود ہے جو مجموعی طور پر اس تہذیب و ثقافت کے خدوخال کو نمایاں کرتا ہے جسے ہم "پاکستانی تہذیب و ثقافت" کہتے ہیں۔

یہ زبانیں مخصوص علاقوں کے تعلق سے بظاہر ایک دوسرے سے مختلف سہی، لیکن اگر بغور دیکھا جائے تو ان میں بڑے گہرے تاریخی، تمدنی اور روحانی رشتے قائم ہیں۔ ان زبانوں کی تاریخ بتاتی ہے کہ ان کی نشوونما جنوبی ایشیا میں مسلمانوں کے دورِ اقتدار کی مرہونِ منت ہے۔ ان کے ذخیرۂ الفاظ، رسم الخط، روزمرہ و محاورات، تلمیحات و ضرب الامثال اور روایات و حکایات سے یہ حقیقت نمایاں ہوتی ہے کہ یہ زبانیں اسلامی تشخص رکھتی ہیں۔ ان زبانوں کے شعر و ادب نے صوفیائے کرام کے فیوض و برکات کے سائے میں پرورش پائی اور یوں ان زبانوں نے اخوت و مساوات، غیرت و حمیّت اور باہمی مہر و محبت کی اعلیٰ انسانی اقدار کی پاسداری کا فریضہ انجام دیا۔ اس کے ساتھ ساتھ اس میں اُن مسلمان مجاہدوں کے نعروں کی گونج اور تلواروں کی جھنکار بھی سنائی دیتی ہے جن کی مجاہدانہ سرگرمیوں کے نتیجے میں ہند میں اسلام کا نور پھیلا۔ پاکستانی زبانوں میں تخلیق ہونے والا ادب تمام پاکستانیوں کی مشترکہ میراث ہے۔

یوں تو پاکستان میں بولی جانے والی ہر زبان اہمیت کی حامل ہے لیکن اپنے دائرۂ اثر کے اعتبار سے پشتو، پنجابی، سندھی، بلوچی، ہندکو، سرائیکی اور کشمیری زبانیں یہاں کی بڑی زبانوں میں شمار ہوتی ہیں۔ شمالی علاقوں اور چترال کی زبانیں بھی قابلِ قدر ادبی سرمایہ رکھتی ہیں۔ پاکستانی زبانوں میں پشتو، پنجابی، سندھی اور بلوچی نہ صرف یہ کہ پاکستانی آبادی کے وسیع حصّے کی زبانیں ہیں بلکہ ان کا قدیم و جدید ادب بھی معیار و مقدار کے لحاظ سے خاصا وقیع ہے۔ سندھ کے شاہ عبداللطیف بھٹائیؒ اور سچل سرمستؒ، پنجاب کے سلطان باہوؒ، وارث شاہؒ اور بلھے شاہؒ، سرحد کے خوشحال خان خٹکؒ اور رحمان باباؒ، بلوچستان کے جام درکؒ اور مست توکلیؒ پاکستانی ادب کی وہ عظیم شخصیات ہیں جن کے شاعرانہ

کارناموں پر ہر پاکستانی کو بجا طور پر فخر ہے۔

پاکستان میں بولی جانے والی زبانیں بیشتر ایک ہی اصل کی مختلف شاخیں ہیں۔ ان کا تعلق زبانوں کے اس وسیع سلسلے سے ہے جو اصطلاح میں "ہند آریائی زبانیں" کہلاتی ہیں۔ جغرافیائی صورتِ حال اور مرورِ زمانہ کے باعث ان میں تغیّرات پیدا ہوتے گئے اور ظاہری ہیئت میں وہ ایک دوسرے سے مختلف ہوتی چلی گئیں۔ مسلمانوں کے دور میں ان زبانوں کے ذخیرۂ الفاظ میں بے حد اضافہ ہوا اور اسلامی اثرات کے تحت ان کے بنیادی مزاج میں نمایاں تبدیلیاں ظہور میں آئیں۔ پاکستان کی یہ زبانیں باہم گہرے تاریخی رشتوں میں پیوست ہیں۔ ان کے ماضی کی طرح ان کا حال بھی انھیں ایک دوسرے سے وابستہ کیے ہوئے ہے۔ ہم علاقائی طور پر سرحدی ہوں یا پنجابی، سندھی ہوں یا بلوچ لیکن یہ حقیقت ہے کہ ہم سب پاکستانی ہیں۔ یہ رشتہ ہمارے تمام نسلی، علاقائی اور لسانی رشتوں پر فوقیت رکھتا ہے۔ اس رشتے سے ہم پر واجب ہے کہ ہم پاکستان کی سبھی زبانوں کا احترام کریں، انھیں اپنی زبانیں سمجھیں اور انھیں ایک دوسرے سے قریب لانے میں کوشاں ہوں۔ ظاہر ہے کہ ہم یہ کوشش زبان ہی کے ذریعے کر سکتے ہیں اور وہ ہماری قومی زبان اُردو ہے۔

اُردو ہی پاکستان کی وہ واحد زبان ہے جو ہمارے کسی ایک علاقے کی زبان نہ ہوتے ہوئے بھی سبھی کی زبان ہے۔ پاکستان کے تمام علاقوں میں یکساں سمجھی، بولی، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔ اس کے علمی و ادبی سرمائے میں پاکستان کے ہر علاقے کے باشندوں نے مقدور بھر اضافہ کیا ہے۔ کوئی علاقہ ایسا نہیں جہاں اُردو کے شاعر اور ادیب موجود نہ ہوں۔ اس زبان کی ہمہ گیری اور ہر دلعزیزی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ پاکستان کے ہر صوبے کا دعویٰ ہے کہ اُردو اس کے ہاں پیدا ہوئی۔ اس ضمن میں ہمارے محققین نے بڑا قابلِ قدر کام کیا ہے۔ "پنجاب میں اُردو"، "سندھ میں اُردو"، "سرحد میں اُردو" اور "بلوچستان میں اُردو" کے عنوانات کے تحت متعدد کتابیں اور طویل مضامین تحریر ہوئے جن سے اُردو زبان کی تاریخ کے باب میں اہم معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس طرح مقامی زبانوں اور اُردو کے لسانی روابط پر بھی خاصی تحقیق ہو چکی ہے۔

اُردو ادب نے دیگر پاکستانی زبانوں کے ادب پر بھی گہرے اثرات ڈالے۔ ان زبانوں کی جدید نثر و نظم میں اُردو ادب سے خاصا استفادہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ان زبانوں کا ادب، اُردو ادب کو بھی متاثر کر رہا ہے۔ نہ صرف یہ کہ ان زبانوں کے ادب کا ایک بڑا حصہ اُردو میں منتقل ہو چکا ہے بلکہ اُردو کے ذخیرۂ الفاظ میں ان زبانوں کے الفاظ کی آمیزش سے خوش گوار اضافہ بھی ہوا ہے۔ اُردو میں اب وہ لب و لہجہ پیدا ہو رہا ہے جسے ہم خالصتاً پاکستانی لب و لہجہ کہہ سکتے ہیں۔

آئین کی رُو سے اُردو پاکستان کی قومی اور سرکاری زبان ہے۔ اس زبان نے جہاں تخلیقِ پاکستان میں اہم کردار ادا کیا ہے وہاں یہ وطنِ عزیز کے مختلف علاقوں کے مابین رابطے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔ یوں یہ زبان وحدتِ پاکستان کی ضامن بھی قرار پائی ہے۔

(متاعِ نقد و نظر)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں۔

(الف) پاکستانی تہذیب وثقافت سے کیا مراد ہے؟

(ب) پاکستان کے مختلف علاقوں کے مابین رابطے کا سب سے بڑا ذریعہ کون سی زبان ہے؟

(ج) ''اس زبان کی ہمہ گیری و ہر دلعزیزی کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ پاکستان کے ہر صوبے کو دعویٰ ہے کہ اُردو اس کے ہاں پیدا ہوئی۔'' اس جملے کی تاریخی اور لسانی حیثیت کیا ہے؟

(د) پاکستان میں بولی جانے والی زبانوں کے وسیع سلسلے کو اصطلاح میں کیا کہتے ہیں؟

(ہ) پاکستان میں چھوٹی بڑی کئی زبانیں بولی جاتی ہیں، یہ کس امر کی آئینہ دار ہیں؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(i) سبق کے متن کے مطابق پاکستانی زبانوں میں باہمی رشتے قائم ہیں:

(الف) مذہبی، تمدنی اور روحانی (ب) تاریخی، تمدنی اور روحانی

(ج) تاریخی، تمدنی اور علاقائی (د) تاریخی، اخلاقی اور روحانی

(ii) شاہ عبداللطیف بھٹائی کا تعلق پاکستان کے صوبے سے ہے:

(الف) خیبرپختونخوا (ب) پنجاب (ج) بلوچستان (د) سندھ

(iii) جنوبی ایشیا کی زبانوں کی نشوونما و ارتقا ارکی مرہونِ منت ہے:

(الف) سکھوں کے (ب) ہندوؤں کے (ج) مسلمانوں کے (د) انگریزوں کے

(iv) پاکستانی زبانوں میں تخلیق ہونے والا ادب تمام پاکستانیوں کی مشترکہ ہے:

(الف) جاگیر (ب) میراث (ج) ثقافت (د) یادگار

(v) وحدتِ پاکستان کی ضامن زبان ہے:

(الف) اُردو (ب) سندھی (ج) بلوچی (د) پنجابی

۳۔ متن کو مدِ نظر رکھتے ہوئے مناسب لفظ کی مدد سے خالی جگہ پر کریں:

(الف) پاکستانی زبانوں میں لوک اور تحریری ادب کا بیش بہا ــــــ موجود ہے۔

(ب) شمالی علاقوں اور چترال کی زبانیں بھی قابلِ قدر ــــــ رکھتی ہیں۔

(ج) پاکستانی ادب کی عظیم شخصیات کے شاعرانہ کارناموں پر ہر ــــــ کو بجا طور پر فخر ہے۔

(د) پاکستان کی یہ زبانیں باہم گہرے تاریخی ۔۔۔۔ میں پیوست ہیں۔

(ہ) اُردو ہی پاکستان کے تمام علاقوں میں یکساں سمجھی، ۔۔۔۔، پڑھی اور لکھی جاتی ہے۔

۴۔ طلبہ پانچ پانچ جملے اپنی مقامی اور علاقائی زبان کے بولیں اور انھیں اُردو زبان میں ترجمہ کر کے ایک دوسرے کو سنائیں۔

۵۔ سبق "پاکستانی زبانیں اور ان کا باہمی رشتہ" کے متن میں سے علاقائی زبانوں اور اُردو کے مشترکہ مستعمل الفاظ کی نشان دہی کریں اور ایک دوسرے کو بتائیں۔

۶۔ دی گئی عبارت کو پڑھیں اور پوچھے گئے سوالات کے جوابات دیں:

حقوق و فرائض کو توازن میں رکھنا خوش حال معاشرے کی بنیاد کا ضامن ہے۔ اگر ہم کماحقہٗ اپنے فرائض کو محنت اور خلوص کے ساتھ انجام دے رہے ہیں تو گویا ہم دوسروں کے حقوق ادا کر رہے ہوتے ہیں اور اپنے فرض کی ادائیگی کے صلے میں اپنا حق حاصل کرنے کے حق دار قرار پاتے ہیں۔ فرائض کی اقسام میں اخلاقی اور قانونی فرائض انتہائی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان فرائض کی انجام دہی سے معاشرہ انفرادی اور اجتماعی سطح پر خوش حال ہو جاتا ہے۔ اپنے ذاتی مفادات کے لیے دوسروں کے حقوق پامال کرنا اخلاقی بے ضابطگی ہے۔ کوڑا کرکٹ سرِ عام پھینکنا، آلودہ پانی گلیوں، سڑکوں پر چھوڑنا اور گھروں میں شور شرابا کرنا ہماری ذات کے لیے تو فرحت و تسکین کا باعث ہو سکتا ہے لیکن یہ عمل ہمسایوں اور محلے داروں کے لیے تکلیف دہ ہوتا ہے۔ ایسا عمل اختیار کرتے ہوئے ہم ایک طرف تو خود اخلاقی بے ضابطگی کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں اور دوسری طرف انسانی حقوق کی خلاف ورزی کے مرتکب بھی ہوتے ہیں۔ دوسروں کے ساتھ حسنِ سلوک اختیار کیے بغیر ہم اپنے آپ کو اچھے ماحول کا حق دار کیوں کر ٹھہرا سکتے ہیں۔ قانونی فرائض کی پاس داری کی صورتِ حال بھی ایسی ہی ہے۔ قوانین ایک طرف تو ریاست کی ترقی کے لیے بنتے ہیں تو دوسری طرف یہ امن و امان قائم رکھنے اور عام شہریوں کے تحفظ کے ضامن بھی ہوتے ہیں۔ جب ہم کوئی قانون شکنی کرتے ہیں تو اس کی گرفت میں آتے ہیں۔ قانونی تقاضے پورے کیے بغیر اس کی حدوں کو تجاوز کر کے ناجائز مراعات حاصل کرنا قانون شکنی بھی ہے اور شہریوں کے حقوق کی پامالی بھی۔ ٹیکس کی عدم ادائیگی، بجلی چوری اور رشوت ستانی اس کی مثالیں ہیں۔

سوالات:

- حقوق و فرائض کے توازن سے کیا مراد ہے؟
- کون سے فرائض انتہائی اہمیت کے حامل ہیں؟
- معاشرہ انفرادی اور اجتماعی طور پر کیسے خوش حال ہوتا ہے؟
- قانون شکنی سے کیا مراد ہے؟
- اس عبارت کا مناسب عنوان تجویز کریں۔

زبان شناسی

حروفِ بیان: ایسے حروف جو کوئی بات کرنے یا بات کی وضاحت کرنے کے لیے دو جملوں کے درمیان لائے جائیں، حروفِ بیان

کہلاتے ہیں۔ جب دو جملوں میں سے دوسرا جملہ اپنے سے پہلے آنے والے جملے کی وضاحت کرتا ہو تو اس کے شروع میں حرف ''کہ'' لایا جاتا ہے۔ مثلاً: اُس نے کہا کہ میں ہرگز جھوٹ نہیں بولوں گا۔ مَیں کہتا ہوں کہ میری بات مان لو۔ یہاں حرف ''کہ'' حرفِ بیان کے طور پر استعمال ہوا ہے۔

۷۔ حروفِ بیان کی مدد سے پانچ جملے بنائیں۔

حروفِ تاکید: ایسے حروف جو کلام میں زور پیدا کرنے اور تاکید کے لیے استعمال کیے جائیں حروفِ تاکید کہلاتے ہیں۔ کلام میں جس حصے پر زور دیا جائے یا تاکید کی جائے اُسے ''موکد'' کہتے ہیں۔ حروفِ تاکید درج ذیل ہیں: بے شک، ہرگز، ضرور، مطلق، سراسر، بھی، قطعی، سبھی، صرف وغیرہ۔

۸۔ حروفِ تاکید کی مدد سے پانچ جملے بنائیں۔

حروفِ علّت: ایسے حروف جو کسی بات کا سبب، وجہ یا باعث بیان کرنے کے لیے استعمال ہوں، حروفِ علّت کہلاتے ہیں، جیسے: تاکہ، آخر، کیوں کہ، اس لیے، اس واسطے، اس باعث، لہٰذا، چوں کہ وغیرہ۔

۹۔ (i) درج ذیل جملوں میں سے حروفِ علّت کی نشان دہی کریں:

(الف) محنت کرو تاکہ کامیاب ہو جاؤ۔ (ب) چوں کہ وہ غریب ہے اس لیے فیس ادا نہیں کر سکتا۔
(ج) مجھ پر رحم کرو آخر میں تمھارا بھائی ہوں۔ (د) مَیں اس لیے جاؤں گا تاکہ اس سے ملاقات ہو جائے۔
(ہ) تم نے وعدہ توڑا لہٰذا اب میں بھی پابند نہیں۔

(ii) ذیل میں دی گئی عبارت غور سے پڑھیں اور حروفِ علّت تلاش کر کے ان کی فہرست بنائیں:

جب تک رنگ نہ ہو پھول وجود میں نہیں آتا، اس لیے پھول کا کوئی نہ کوئی رنگ ضرور ہوتا ہے۔ لہٰذا صحیح آواز اور حرکت کا ایک دوسرے کے ساتھ ایسا ہی تعلق ہے جیسے پھول کا رنگ سے۔ آواز حرکات یعنی زیر، زبر، پیش وغیرہ کے ساتھ رہتی ہے تاکہ اپنی شناخت قائم رکھے۔ یہ الگ بات ہے کہ وہ اپنی بنیاد اور ذات کے حوالے سے اپنا وجود رکھتی ہے۔ پس ہم کہہ سکتے ہیں کہ حرکتیں صحیح آواز کو جوڑ کر آوازوں کا ایک نظام بناتی ہیں۔

۱۰۔ سیاق و سباق کے حوالے سے درج ذیل اقتباسات کی تشریح کریں اور حوالۂ متن بھی درج کریں:

''پاکستان میں بولی جانے والی زبانیں۔۔۔۔۔۔۔ہماری قومی زبان اُردو ہے۔''

''اُردو ادب نے دیگر پاکستانی زبانوں۔۔۔۔۔۔۔خالصتاً پاکستانی لب و لہجہ کہہ سکتے ہیں۔''

روزمرہ: اہلِ زبان ایک طویل عرصے سے زبان کو پڑھنے، بولنے اور لکھنے کے لیے استعمال کر رہے ہوتے ہیں، اس لیے ان کا پڑھا، بولا اور لکھا درست تصور کیا جاتا ہے۔ اہلِ زبان اپنے معمول کی بول چال میں جو الفاظ و تراکیب استعمال کرتے ہیں، اسے روزمرہ کہتے ہیں۔ مثلاً: آئے دن، ہر روز، تقدیر کا لکھا، توبہ ہی بھلی وغیرہ۔

۱۱۔ روزمرہ کے لحاظ سے درج ذیل جملوں کی درستی کریں:

(الف) وہ دن بدن کم زور ہو رہا ہے۔ (ب) دن دن کا آنا جانا قدر کھو دیتا ہے۔
(ج) اسد آئے روز غیر حاضر رہتا ہے۔ (د) یہ لڑکی بڑی لڑاکی ہے۔
(ہ) ہم ہر دن سیر کو جاتے ہیں۔ (و) وہ لڑکا تو گھوڑے فروخت کر کے سویا ہوا ہے۔

۱۲۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کا مفہوم واضح ہو جائے:

آئینہ دار، بیش بہا، تہذیب و ثقافت، نشوونما، مرہونِ منت،
رسم الخط، مشترکہ میراث، ذخیرۂ الفاظ، وحدتِ پاکستان، خدوخال

۱۳۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں:

پاکستانیت، تمدن، حمیت، اصطلاح، فوقیت، آمیزش

سرگرمی برائے طلبہ:

- اُردو محاورات اور روزمرہ کی چند مشہور مثالوں کی فہرست بنائیں اور جماعت میں سنائیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو اردو زبان کے آغاز و ارتقا کے حوالے سے معروف نظریات سے آگاہ کریں۔
- طلبہ کو سمجھائیں کہ اردو اور علاقائی زبانوں میں فطری طور پر قربت موجود ہے۔
- طلبہ کو بشمول حروفِ علت، حروفِ بیان، حروفِ تاکید، اور حروف کی دیگر اقسام کے بارے میں معلومات فراہم کریں۔

حصہ نظم

علامہ محمد اقبالؒ

(۱۸۷۷ء۔۱۹۳۸ء)

علامہ محمد اقبالؒ سیال کوٹ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والدِ گرامی شیخ نور محمد بڑے پرہیز گار اور عبادت گزار انسان تھے۔ اُن کی والدہ امام بی بی بھی بڑی خلیق، نیک سیرت اور زاہدہ و عابدہ خاتون تھیں۔ ان کا زیادہ وقت محلے کی بچیوں کو تعلیم دینے اور عبادت و ریاضت میں گزرتا تھا۔ نیکو کار والدین سے تربیت پانے کے ساتھ ساتھ اقبالؒ نے ابتدائی تعلیم سید میر حسن کی درس گاہ سے حاصل کی۔ علامہ اقبالؒ اپنے مقام و مرتبہ کو ہمیشہ انھی کا فیض سمجھتے تھے۔ سیال کوٹ سے انٹرمیڈیٹ کے بعد بی اے اور ایم اے کے امتحانات گورنمنٹ کالج، لاہور سے پاس کیے۔ گورنمنٹ کالج لاہور میں انھیں فلسفے کے استاد پروفیسر تھامس آرنلڈ مل گئے جو ان کی صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ انھوں نے فلسفے کے ساتھ اقبالؒ کے فطری لگاؤ کو دیکھ کر ان کے خیالات کو اور بھی جلا بخشی۔ پروفیسر تھامس آرنلڈ اپنے احباب میں اقبالؒ کی تعریف کیا کرتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ ایسا شاگرد استاد کو محقق اور محقق کو محقق تر بنا دیتا ہے۔ بعدازاں اقبالؒ ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک یورپ میں مقیم رہے۔ انھوں نے جرمنی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری لی جب کہ لندن سے قانون کی سب سے بڑی ڈگری بار ایٹ لا حاصل کی۔

علامہ محمد اقبالؒ برِ عظیم کے مسلمانوں بلکہ امتِ مسلمہ کے اس لحاظ سے بہت بڑے محسن ہیں کہ انھوں نے اپنے کلام کے ذریعے سے مسلمانوں کے دلوں میں حرارت اور خیالات میں انقلاب پیدا کیا۔ وہ حرکت و عمل کے شاعر ہیں۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے پیرویِ قرآن اور اطاعتِ رسول خاتم النبیین ﷺ کا درس دیا اور خودی، مردِ مومن اور شاہین جیسی فلسفیانہ اصطلاحات اور علامات کے ذریعے سے مسلمانوں میں نئی روح پھونکنے کی کام یاب کوشش کی۔ اسی بنا پر انھیں ''حکیم الامت'' اور ''شاعرِ مشرق'' جیسے القاب سے یاد کیا جاتا ہے۔

علامہ محمد اقبالؒ کی کتابوں میں ''بانگِ درا''، ''بالِ جبریل''، ''ضربِ کلیم'' اور ''ارمغانِ حجاز'' (نصف حصہ) اُردو شاعری کی کتابیں ہیں جب کہ ''اسرار و رموز''، ''پیامِ مشرق''، ''زبورِ عجم''، ''جاوید نامہ'' اور ''ارمغانِ حجاز'' (نصف حصہ) فارسی شعری مجموعے ہیں۔ اس نصابی کتاب میں ان کی نظم: ''اے وادیِ لولاب!'' شامل ہے جو ''ارمغانِ حجاز'' سے لی گئی ہے۔

سبق: ۱۳

اے وادیِ لولاب! (۱)

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو وادیِ لولاب کی سیاحتی، تاریخی اور ثقافتی اہمیت سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کو علامہ اقبالؒ کی اس نظم کے معانی، مفاہیم اور مطالب سے روشناس کرنا۔
- ڈاکٹر علامہ محمد اقبالؒ کے فلسفیانہ خیالات، امتِ مسلمہ کے احیا کے لیے کوششوں پر روشنی ڈالنا۔
- طلبہ کو یاد کرانا کہ فکرِ اقبال کو سمجھنا اور اس پر عمل کرنا وقت کی اہم ضرورت ہے۔
- طلبہ میں شعری محاسن کی پہچان پیدا کرنا۔

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحَر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
اے وادیِ لولاب!

گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندۂ مومن کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادیِ لولاب!

ہیں ساز پہ موقوف نوا ہائے جگر سوز
ڈھیلے ہوں اگر تار تو بے کار ہے مِضراب
اے وادیِ لولاب!

مُلّا کی نظر نُورِ فراست سے ہے خالی
بے سوز ہے مے خانۂ صوفی کی مے ناب
اے وادیِ لولاب!

بیدار ہُوں دل جس کی فغانِ سحری سے
اس قوم میں مدّت سے وہ درویش ہے نایاب
اے وادیِ لولاب!

(ارمغانِ حجاز)

(۱) کشمیر کی انتہائی خوب صورت وادی ہے جو خطۂ کشمیر کے شمال مغرب میں سری نگر سے ۱۱۵ کلومیٹر کے فاصلے پر ضلع کپواڑہ میں واقع ہے۔

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) وادیِ لولاب کے دل کش حسن کو کس طرح بیان کیا گیا ہے؟
(ب) علامہ اقبالؒ نے صاحبانِ منبر و محراب کے بارے میں کن خیالات کا اظہار کیا ہے؟
(ج) دوسرے شعر کا مفہوم لکھیں۔
(د) نواہائے جگر سوز کا دارومدار کس بات پر ہے؟
(ہ) قوم میں کس طرح کے درویش نایاب ہیں؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) وادیِ لولاب سے مراد ہے:
(الف) ملکۂ کوہسار مری (ب) وادیِ نیلم (ج) وادیِ کشمیر (د) وادیِ زیارت

(ii) وادیِ لولاب کے چشموں کا پانی ہے:
(الف) زریاب (ب) سیماب (ج) کم یاب (د) نایاب

(iii) نواہائے جگر سوز موقوف ہیں:
(الف) ساز پر (ب) ناز پر (ج) راز پر (د) دراز پر

(iv) تار ڈھیلے ہوں تو بے کار ہے:
(الف) ساز (ب) مضراب (ج) گٹار (د) بگل

(v) بے سوز ہے:
(الف) مے خانہ (ب) جم خانہ (ج) مردِ رندانہ (د) فرزانہ

(vi) قوم میں مدت سے فغانِ سحری والے نایاب ہیں:
(الف) فقیر (ب) درویش (ج) پیر (د) شاعر

۳۔ نظم "اے وادیِ لولاب!" کے چوتھے بند کی روشنی میں درج ذیل شعر پر باہمی گفت گو کریں اور مشترک رائے قلم بند کریں:

کیا صوفی و مُلّا کو خبر میرے جنوں کی
ان کا سرِ دامن بھی ابھی چاک نہیں ہے

۴۔ اقبالؒ کے کلام میں مئے لالہ فام، مئے ناب اور بادۂ ناب وغیرہ کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ مثلاً:

مرے کدو کو غنیمت سمجھ کہ بادۂ ناب
نہ مدرسے میں ہے باقی نہ خانقاہ میں ہے

علامہ اقبالؒ کے اشعار کی روشنی میں ان تراکیب کی وضاحت کریں:

مرغانِ سحر، صاحبِ ہنگامہ، بندۂ مومن، نورِ فراست، فغانِ سحری

۵۔ نظم اے وادیِ لولاب! کا اصل عنوان "ملّا زادہ ضیغم لولابی کشمیری کا بیاض" ہے۔ اقبالؒ نے اس جرأت مند فرضی کردار کے ذریعے سے کشمیریوں کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔ کلامِ اقبالؒ سے کشمیر کے حوالے سے مزید اشعار تلاش کر کے "اقبالؒ اور کشمیر" کے عنوان پر ایک تقریر تیار کریں۔

۶۔ مختلف حوالوں سے اور شعری محاسن کی روشنی میں تشریح کریں:

پانی ترے چشموں کا تڑپتا ہوا سیماب
مرغانِ سحَر تیری فضاؤں میں ہیں بے تاب
اے وادیِ لولاب!
گر صاحبِ ہنگامہ نہ ہو منبر و محراب
دیں بندۂ مومن کے لیے موت ہے یا خواب
اے وادیِ لولاب!

۷۔ نظم "اے وادیِ لولاب!" کا خلاصہ تحریر کریں۔

۸۔ نیچے دیے گئے الفاظ وتراکیب کے معانی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں۔

وادیِ لولاب	سیماب
منبر ومحراب	موقوف
نورِ فراست	بے سوز

۹۔ علامہ اقبالؒ کے اشعار کی روشنی میں ان کی شخصیت کا مرقع پیش کریں۔

۱۰۔ "اے وادیِ لولاب!" کے اشعار کی روشنی میں مسلمانوں خصوصاً کشمیر اور غزہ کے مسلمانوں کو درپیش مسائل پر تبادلۂ خیال کریں اور ان کے حل کے لیے تجاویز پیش کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- علامہ اقبالؒ کے اشعار کی روشنی میں آزادیِ کشمیر کے موضوع پر کسی ڈرامے کا اہتمام کریں۔
- یومِ کشمیر کے موقع پر کشمیر کے حوالے سے کلامِ اقبالؒ سنانے کے مقابلے میں حصّہ لیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو نظم "اے وادیِ لولاب!" کا مکمل تعارف کرائیں۔
- کشمیر سے علامہ اقبالؒ کی محبت اور اس کی تعمیر وترقی کے لیے کوششوں سے آگاہ کریں۔
- علامہ اقبالؒ کی ایک معروف نظم "بڈھے بلوچ کی نصیحت بیٹے کو" کے کرداروں کا تعارف کرائیں۔

اختر شیرانی

(۱۹۰۵ء۔۱۹۴۸ء)

شاعرِ رومان: اختر شیرانی کا اصل نام محمد داؤد خان اور تخلص اختر ہے۔ آپ نامور محقق حافظ محمود شیرانی کے بیٹے تھے۔ ٹونک (راجپوتانہ) میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ٹونک ہی میں حاصل کی۔ پھر مزید تعلیم کے لیے اپنے والدِ گرامی کے پاس لاہور چلے آئے، جہاں ۱۹۲۱ء میں اورینٹل کالج سے منشی فاضل اور ادیب فاضل کا امتحان پاس کیا۔ مزید تعلیمی سلسلہ جاری نہ رکھ سکے، البتہ انگریزی زبان و ادب کا مطالعہ نجی اور ذاتی حیثیت سے جاری رکھا اور مضمون نگاری و شعر و شاعری کا آغاز کر دیا۔ ان کا کلام مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتا رہا۔

بعض رسائل میں بطور مدیر بھی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۲۸ء میں ماہ نامہ "بہارستان" نکالا جو چل نہ سکا۔ ۱۹۳۰ء میں "خیالستان" جاری کیا۔ وہ بھی زیادہ عرصہ نہ چلا۔ ۱۹۳۵ء میں ماہ نامہ "رومان" کا بھی یہی نتیجہ برآمد ہوا۔ اسی اثنا میں اختر شیرانی کی شاعری کی دھوم مچ گئی اور ان کا شمار ملک کے چوٹی کے شعرا میں ہونے لگا۔ ۱۹۴۰ء میں حافظ محمود شیرانی اورینٹل کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہو کر اپنے وطن ٹونک چلے آئے۔ چناں چہ اختر شیرانی کو بھی ٹونک جانا پڑا۔ دوسری عالمی جنگ کے دوران میں وہ پھر لاہور لوٹ آئے۔

مولانا تاجور نجیب آبادی نے اپنے رسالے "شاہکار" کی ادارت ان کے سپرد کر دی لیکن اختر شیرانی تھوڑے ہی عرصہ بعد "شاہکار" سے الگ ہو گئے۔ اس عرصے میں انھوں نے اپنے شعری مجموعے "نغمۂ حرم"، "شعرستان"، "لالۂ طور"، "صبحِ بہار"، "اخترستان" اور "طیورِ آوارہ" کے نام سے شائع کیے۔ انھوں نے چند ڈرامے بھی لکھے، جن میں "ضحاک" زیادہ مشہور ہے۔

اختر شیرانی کی بہت سی نظمیں مظاہرِ فطرت، رومان اور مناظرِ قدرت کی عکاسی کرتی ہیں۔ ان کے شعور کا سماجی اور سیاسی پس منظر دوسرے بہت سے شعرا سے مختلف ہے۔ اس لیے ان کے محرکاتِ شاعری اور تخیل کے اجزائے ترکیبی دوسروں سے جدا ہیں۔ انھوں نے اپنے تخیل سے حسن و شباب، سرخوشی و خود فراموشی اور امن و سکون کی ایک نئی دنیا تخلیق کی ہے۔ ان کے گیتوں میں رس ہے، ان کی نظموں میں مخصوص نغماتی فضا پیدا ہو جاتی ہے اور وہ اس میں ڈوب کر محبت کے گیت گانے لگتے ہیں۔ شاملِ نصاب نظم "او دیس سے آنے والے بتا!" اسی نوعیت کی حامل نظم ہے۔

سبق: ۱۴

او دیس سے آنے والے بتا!

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو اختر شیرانی کی شخصیت اور فن سے متعارف کرانا۔
- طلبہ میں جذبۂ حب الوطنی پیدا کرنا۔
- طلبہ کی تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتوں کو جلا بخشنا۔
- اُردو ادب میں رومانوی تحریک کے آغاز اور ارتقا کے بارے میں بتانا۔

او دیس سے آنے والے بتا!

او دیس سے آنے والے بتا کس حال میں ہیں یارانِ وطن
آوارۂ غربت کو بھی سنا کس رنگ میں ہے کنعانِ وطن
وہ باغِ وطن، فردوسِ وطن، وہ سروِ وطن، ریحانِ وطن
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وہاں کے باغوں میں مستانہ ہوائیں آتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کے پربت پر گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں
کیا اب بھی وہاں کی برکھائیں ویسے ہی دلوں کو بھاتی ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی وطن میں ویسے ہی سرمست نظارے ہوتے ہیں
کیا اب بھی سہانی راتوں کو وہ چاند ستارے ہوتے ہیں
ہم کھیل جو کھیلا کرتے تھے کیا اب بھی وہ سارے ہوتے ہیں
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا شام کو اب بھی جاتے ہیں احباب، کنارِ دریا پر
وہ پیڑ گھنیرے اب بھی ہیں شاداب ، کنارِ دریا پر
اور پیار سے آکر جھانکتا ہے مہتاب، کنارِ دریا پر
او دیس سے آنے والے بتا!

کیا اب بھی کسی کے سینے میں باقی ہے ہماری چاہ ، بتا
کیا یاد ہمیں بھی کرتا ہے اب یاروں میں کوئی آہ ، بتا
او دیس سے آنے والے بتا ، للہ بتا ، للہ بتا
او دیس سے آنے والے بتا!

(کلیاتِ اختر شیرانی)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) شاعر اس نظم میں کس سے مخاطب ہے؟

(ب) شاعر کو کس کی یاد ستا رہی ہے؟

(ج) شاعر نے خود کو آوارۂ غربت کیوں کہا؟

(د) وطن کی ہوائیں اور گھٹائیں کیسی ہیں؟

(ہ) سرمست نظاروں سے شاعر کی کیا مراد ہے؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) نظم ''او دیس سے آنے والے بتا!'' کے شاعر ہیں:

(الف) احمد ندیم قاسمی (ب) اختر شیرانی (ج) ابنِ انشا (د) جمیل الدین عالی

(ii) شاعر کو کہاں کی یاد ستا رہی ہے؟

(الف) باغ کی (ب) سمندر کی (ج) وطن کی (د) صحرا کی

(iii) ''کنعانِ وطن'' اُردو قواعد کی رو سے ہے:

(الف) تشبیہ (ب) استعارہ (ج) تلمیح (د) کنایہ

(iv) ''یارانِ وطن'' اُردو قواعد کی رو سے ہے:

(الف) مرکب عطفی (ب) مرکب اضافی (ج) مرکب توصیفی (د) مرکب عددی

(v) وطن کے باغوں میں ہوائیں چلتی ہیں:

(الف) خشک (ب) مستانہ وار (ج) مخمور (د) تیز تیز

(vi) دریا میں پیار سے جھانکتا ہے:

(الف) حباب (ب) شباب (ج) مہتاب (د) آفتاب

(vii) وطن کے پیڑ ہیں:

(الف) گھنیرے (ب) پھل دار (ج) سرسبز (د) سایہ دار

۳۔ نظم ''او دیس سے آنے والے بتا!'' کا خلاصہ تحریر کریں۔

۴۔ نظم ''او دیس سے آنے والے بتا!'' کے پہلے بند میں استعمال ہونے والی تلمیح کی روشنی میں بند کی تشریح کریں اور مرزا غالب و مولانا حالی کے درج ذیل اشعار کو بھی شامل کریں۔

نسیمِ مصر کو کیا پیرِ کنعاں کی ہوا خواہی
اسے یوسفؑ کی بوئے پیرہن کی آزمائش ہے

❋

آ رہی ہے چاہِ یوسفؑ سے صدا
دوست یاں تھوڑے ہیں اور بھائی بہت

۵۔ اپنے ہم وطن کو دیکھ کر شاعر کے دل میں کیا کیا جذبے بیدار ہوتے ہیں اور وہ کیا جاننا چاہتا ہے؟ نظم "او دیس سے آنے والے بتا!" کی روشنی میں بیان کریں۔

۶۔ کیا نظم "او دیس سے آنے والے بتا!" کے آخری بند میں شاعر کی خواہشوں کا رخ تبدیل ہوا ہے؟ وضاحت کریں۔

مرکبِ ناقص، مرکبِ اضافی، مرکبِ توصیفی اور مرکبِ عطفی:

مرکبِ ناقص: دو الفاظ سے مل کر بننے والا ایسا مرکب جو بامعنی تو ہو لیکن اس سے پورا مطلب واضح نہ ہو۔ مثلاً: تیز گھوڑا، نیک آدمی، رات اور دن وغیرہ۔

مرکبِ اضافی: جب دو لفظ حرفِ اضافت، زیرِ اضافت یا ہمزۂ اضافت سے مل کر مرکب بنائیں تو اسے مرکبِ اضافی کہتے ہیں۔ مثلاً: شامِ غریباں، دوستوں کی محفل، نورِ حق، حلقۂ زنجیر وغیرہ۔

مرکبِ توصیفی: صفت اور موصوف سے مل کر بننے والے مرکبِ ناقص کو مرکبِ توصیفی کہتے ہیں۔ مثلاً: روشن چاند، خوب صورت پھل، سفید پتھر وغیرہ۔

مرکبِ عطفی: حرفِ عطف "اور"، "و" سے مل کر بننے والے مرکبِ ناقص کو مرکبِ عطفی کہتے ہیں۔ مثلاً: صبح وشام، حق و باطل، چاند اور سورج وغیرہ۔

نظم "او دیس سے آنے والے بتا" میں استعمال ہونے والے ان چاروں مرکبات کی فہرست بنائیں، ان کے معانی لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں۔

۷۔ درج ذیل الفاظ کے مترادفات تلاش کریں:

وطن	غربت	فردوس
سہانی	احباب	مہتاب

۸۔ طلبہ زیرِ مطالعہ نظم "او دیس سے آنے والے بتا" کے بارے میں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کریں اور تاثراتی تبصرہ کریں۔ اس میں حسرت موہانی کا درج ذیل شعر بھی شامل کریں:

غربت کی صبح میں بھی نہیں ہے وہ روشنی
جو روشنی کہ شامِ سوادِ وطن میں تھی

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- حبِ وطن کے موضوع پر تقاریر میں حصہ لیں اور مناسب اشعار استعمال کریں۔
- شعری ذوق رکھنے والے طلبہ کوئی ملی نغمہ تخلیق کرنے کی کوشش کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ کرام:

- اختر شیرانی کی رومانوی شاعری کے بارے میں معلومات دیں۔
- جذبۂ حب الوطنی کی ضرورت و اہمیت واضح کریں۔

برائے اضافی مطالعہ

ساون کی گھٹا

مسکراتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
جی لبھاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
گیت کوئل کے، پپیہوں کی صدا، مور کا شور
گنگناتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
کیوں نہ ہم جولیاں گلزار میں جھولا جھولیں
لہلہاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
کوہساروں کا، خیابانوں کا، گلزاروں کا
منھ دُھلاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی
موجِ نکہت سے خدائی مہک اٹھی اختر
پھول اڑاتی ہوئی آتی ہے گھٹا ساون کی

(اختر شیرانی)

احسان دانش

(۱۹۱۴ء-۱۹۸۲ء)

نام احسان الحق اور تخلص بھی احسان ہی تھا۔ کبھی وہ اپنے والد قاضی دانش علی کی نسبت سے اپنا پورا نام احسان بن دانش لکھتے تھے۔ پھر "احسانِ دانش" لکھنے لگے جو بعد میں اضافت کی زیر کو حذف کر کے احسان دانش کی صورت اختیار کر گیا اور کبھی کبھی اپنا تخلص "دانش" بھی کرنے لگے۔

ان کا آبائی وطن باغ پت ضلع میرٹھ ہے لیکن احسان دانش کی ولادت، پرورش اور ابتدائی تعلیم اپنی والدہ کے قصبے کاندھلہ ضلع مظفر آباد (ہندوستان) میں ہوئی۔ مالی حالت اچھی نہ تھی اس لیے باقاعدہ تعلیم نہ پاسکے اور وقتاً فوقتاً معمولی نوعیت کے کام کرنے لگے جن میں مزدوری کے علاوہ باغبانی اور قلعی تک کے کام بھی شامل تھے۔ احسان دانش نے کسی زمانے میں انارکلی بازار لاہور کی بغلی سڑک ایبک روڈ پر "مکتبۂ دانش" بھی قائم کیا تھا، جہاں وہ مخطوطات کا کاروبار کرتے تھے۔

احسان کو شاعری سے لگاؤ چھوٹی عمر ہی سے ہو گیا تھا اور وہ قیامِ پاکستان سے بہت پہلے لاہور آگئے تھے۔ یہاں کے ادبی ماحول نے انھیں بہت جلد محفلوں میں نمایاں کر دیا۔ احسان دانش اُردو کے نامور شاعر اور فاضل ادیب علامہ تاجور نجیب آبادی کے تلامذہ میں شامل تھے۔ وہ مشاعروں میں اپنا کلام دل کش ترنم سے پڑھتے تھے۔ وہ بہت سادہ، فقیر منش، خوش اخلاق اور ملنسار شخص تھے۔

احسان دانش کے کلام میں نظم، غزل، قطعہ، رباعی، گیت وغیرہ سب کچھ ملتا ہے لیکن ان کی اصل شہرت بیانیہ نظموں کی وجہ سے ہے۔ وہ خود مزدور تھے اور مزدوروں کے لیے انھوں نے بہت کچھ لکھا، اس لیے انھیں "شاعرِ مزدور" بھی کہا جاتا ہے۔ ان کی شاعری کے کئی ایک مجموعے چھپ چکے ہیں جن میں "آتشِ سیال"، "نوائے کارگر"، "تفسیرِ فطرت"، "جادۂ نو"، "فصلِ سلاسل" اور "چراغاں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ "دارین" کے نام سے ان کا نعتیہ کلام بھی منظرِ عام پر آچکا ہے۔

احسان دانش نے جو نظمیں محنت مزدوری کے موضوع پر لکھی ہیں، ان میں واقعیت نگاری کا رنگ موجود ہے۔ وہ بلاشبہ اُردو کے ایک عظیم نظم نگار تھے۔ ان کی غزل میں تغزل کے جملہ اوصاف: دل کشی، دل سوزی، دل ربائی اور دل آویزی موجود ہیں۔

شاعری کے علاوہ وہ ایک نثر نگار بھی تھے۔ انھوں نے نثر میں بھی بعض ضروری موضوعات مثلاً ضرب الامثال، تذکیر و تانیث اور مترادفات پر کام کیا جو چھپ چکا ہے۔ احسان دانش نے "جہانِ دانش" کے نام سے اپنی آپ بیتی بھی لکھی جو بہت مقبول ہے۔

سبق: ۱۵

آزادی

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو احسان دانش کی شخصیت اور فن سے آشنا کرنا۔
- طلبہ کو احسان دانش کی نظم نگاری کی نمایاں خصوصیات کے بارے میں بتانا۔
- طلبہ کو قومی اور ملی شاعروں کا تعارف کرانا اور اس کے پس منظر سے روشناس کرنا۔
- طلبہ کو آزادی کی نعمت کے بارے میں آگاہ کرنا اور یہ بات باور کرانا کہ جہاں آزادی کے حصول کے لیے محنت اور ایثار ضروری ہے، وہاں آزادی کی حفاظت کے لیے بھی بہت کچھ کرنا پڑتا ہے۔

عبادت ہے سراپا جذبۂ تعمیرِ آزادی
شہادت مستقل اک سرخیِ تحریرِ آزادی
جہاں آزاد کر سکتے نہ ہوں تقریرِ آزادی
وہ آزادی مری نظروں میں ہے تحقیرِ آزادی
فضائیں کر رہی ہیں ذوقِ ایثار و عمل پیدا
لہو میں دوڑتا ہے شعلۂ تاثیرِ آزادی
لہو موسم نے رویا، گردشِ گردوں نے رُخ بدلا
مرے خوابوں میں نازل ہو گئی تعبیرِ آزادی
جو کہنا تھا اُسے سب کہ گیا قرآں کے پردے میں
زمانہ حشر تک کرتا رہے تفسیرِ آزادی
لہو برسا، بہے آنسو ، لٹے رہرو، کٹے رشتے
ابھی تک نامکمل ہے مگر تعمیرِ آزادی
مجھے دنیا کے ہر گوشے میں قندیلیں جلانے دو
مرا مذہب ہے اِک پیغامِ عالمگیرِ آزادی
زمانے کو اب آزادی کے معنی ہم بتائیں گے
غلط ہوتی رہی ہے آج تک تفسیرِ آزادی
تڑپ کر بزم میں دانش چلے آتے ہیں پروانے
اندھیروں سے مگر پھوٹی نہیں تنویرِ آزادی

(فصلِ سلاسل)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) شاعر نے کس آزادی کو تحقیرِ آزادی کہا ہے؟

(ب) شاعر نے کس چیز کو عبادت قرار دیا ہے؟

(ج) قرآن کے پردے میں کیا پیغام دیا گیا ہے؟

(د) کون سی قربانیاں دینے کے باوجود ابھی تک تعمیرِ آزادی نامکمل ہے؟

(ہ) شاعر کے خیال میں اس کا مذہب کس چیز کا پیغام دیتا ہے؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) عبادت ہے سراپا:

(الف) بندگی (ب) عشق (ج) اطاعت (د) جذبۂ تعمیرِ آزادی

(ii) تحریرِ آزادی کی مستقل سُرخی ہے:

(الف) محبت (ب) شہادت (ج) عقیدت (د) الفت

(iii) اس نظم میں "آزادی" ہے:

(الف) قافیہ (ب) ردیف (ج) قافیہ اور ردیف دونوں (د) تشبیہ

(iv) یہ نظم ہیئت میں لکھی گئی ہے:

(الف) مثنوی (ب) رباعی (ج) مسدّس (د) غزل

(v) "تفسیرِ آزادی" قواعد کی رُو سے ہے:

(الف) مرکبِ اضافی (ب) مرکبِ توصیفی (ج) مرکبِ عطفی (د) مرکبِ تام

(vi) شاعر جلانا چاہتا ہے:

(الف) چراغ (ب) شمعیں (ج) قندیلیں (د) موم بتیاں

۳۔ نظم "آزادی" کا خلاصہ تحریر کریں۔

۴۔ لغت کی مدد سے درج ذیل الفاظ پر دُرست اِعراب لگائیں، مطلب لکھیں اور جملوں میں استعمال کریں:

سراپا مستقل ذوق شعلہ قندیل تنویر

۵۔ نظم میں استعمال ہونے والے مرکبِ اضافی اور مرکبِ عطفی کی فہرست بنائیں اور معانی لکھیں۔

۶۔ محاسنِ شعری اور حوالوں کے ساتھ درج ذیل اشعار کی تشریح کریں:

لہو موسم نے رویا، گردشِ گردوں نے رُخ بدلا
مرے خوابوں میں نازل ہو گئی تعبیرِ آزادی
جو کہنا تھا اُسے سب کہ گیا قرآں کے پردے میں
زمانہ حشر تک کرتا رہے تفسیرِ آزادی
لہو برسا، بہے آنسو، لٹے رہرو، کٹے رشتے
ابھی تک نامکمل ہے مگر تعمیرِ آزادی

۷۔ احسان دانش کی نظم ''آزادی'' کا یہ شعر غور سے پڑھیں:

جو کہنا تھا اُسے، سب کہ گیا قرآں کے پردے میں
زمانہ حشر تک کرتا رہے تفسیرِ آزادی

اس شعر میں غالباً علامہ اقبالؒ کی طرف اشارہ ہے۔ علامہ اقبالؒ کے درج ذیل اشعار پڑھیں اور ان کے نظریہ آزادی وغلامی پر تبصرہ کریں:

غلامی کیا ہے؟ ذوقِ حُسن و زیبائی سے محرومی
جسے زیبا کہیں آزاد بندے، ہے وہی زیبا
بھروسا کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا
وہی ہے صاحبِ امروز جس نے اپنی ہمت سے
زمانے کے سمندر سے نکالا گوہرِ فردا

۸۔ احسان دانش کے درج ذیل شعر کی تشریح کریں:

جہاں آزاد کر سکتے نہ ہوں تقریرِ آزادی
وہ آزادی مری نظروں میں ہے تحقیرِ آزادی

۹۔ مولانا ظفر علی خاں کے درج ذیل اشعار پر تحریکِ آزادی کے تناظر میں تنقید اور تبصرہ کریں:

کوئی دن جاتا ہے پیدا ہو گی اک دنیا نئی
خونِ مسلم صَرفِ تعمیرِ جہاں ہو جائے گا
بجلیاں غیرت کی تڑپیں گی فضائے قدس میں
حق عیاں ہو جائے گا، باطل نہاں ہو جائے گا

نغمہ آزادی کا گونجے گا حرم اور دَیر میں
وہ جو دارُالحرب ہے ، دارالاماں ہو جائے گا

۱۰۔ ہندوستان کی آزادی کے لیے سلطان ٹیپو کی کوششوں کے موضوع پر دو دوستوں کے مابین مکالمہ تحریر کریں۔

سرگرمی برائے طلبہ:

- ''شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے۔'' کے موضوع پر مباحثے میں حصہ لیں اور اپنے نقطۂ نظر کے حق میں دلائل دیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- دُرست تلفظ اور اتار چڑھاؤ کے ساتھ نظم کی مثالی بلند خوانی کریں۔
- مرکبات اور تراکیب کی وضاحت کریں۔
- شعری اصطلاحات کا تعارف مثالوں کے ساتھ کرائیں۔
- آزادی کی اہمیت واضح کریں اور تاریخی، سیاسی، مذہبی اور سماجی حوالوں سے ادب پاروں کی تفہیم کا شعور اجاگر کریں۔

رحمان باباؒ

(۱۶۳۲ء-۱۷۰۶ء)

نام عبدالرحمان ہے۔ آپ پشاور کے قریب "بہادر کلے" ایک گاؤں میں پیدا ہوئے اور رحمان بابا کے نام سے مشہور ہوئے۔ والد کا نام عبدالستار تھا جو مہمند قبیلے سے تعلق رکھتے تھے۔ فقہ اور تصوّف کی تعلیم اپنے گاؤں کے جیّد عالمِ دین ملا محمد یوسف سے حاصل کی۔ اس کے بعد کوہاٹ چلے گئے جہاں آپ نے جذب و سلوک کی منزلیں طے کیں۔ جوانی ہی میں گوشہ نشینی اختیار کر لی اور اکثر عشقِ ربانی میں ڈوبے رہتے۔

پشتو کے عظیم شاعر رحمان بابا ایک صاحبِ طرز شاعر ہیں جو دوسرے پشتو شعرا سے الگ اپنا مکتبِ فکر رکھتے ہیں۔ رحمان بابا کے کلام میں خودی کی تعلیم اور عالم گیر انسانی مساوات کا درس ملتا ہے۔ آپ کا پیغام محبت ہے۔ تمام انسانوں سے محبت، ساری کائنات سے محبت۔ اگر نفرت ہے تو ظلم سے، بے انصافی سے، استحصال سے، جبر و تشدد اور آمریت سے۔ یہی آپ کی متصوفانہ شاعری کی اساس ہے اور یہی خصوصیت ہے جو انھیں دوسرے پشتو شعرا سے ممتاز کرتی ہے۔ مجموعی طور پر ان کے ہاں اخلاقی پہلو غالب ہے لیکن انھوں نے اس ناصحانہ اسلوب کو بھی خشک اور ناگوار نہیں رہنے دیا اسی لیے وہ پشتو شاعری کے "حافظ شیرازی" کہلاتے ہیں۔

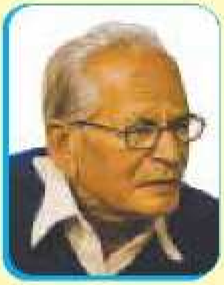

پروفیسر محمد طٰہٰ خان

(۱۹۳۱ء-۲۰۱۳ء)

پروفیسر محمد طٰہٰ خان ایک کثیر الجہت شخصیت کے مالک تھے۔ انھوں نے علم و ادب کے میدان میں مختلف پہلوؤں سے اپنی پہچان کروائی۔ وہ ایک قابل استاد تھے جو ان کی بنیادی حیثیت تھی۔ اپنے فرائضِ منصبی کے ساتھ ساتھ انھوں نے تنقید و تحقیق، شاعری اور ترجمہ کرنے میں بھی اپنے جوہر دکھائے۔ وہ ایک براڈ کاسٹر بھی تھے۔ ان سب صلاحیتوں کے علاوہ طنزیہ و مزاحیہ شاعری ان کی خاص پہچان ہے۔

انھوں نے عظیم پشتو شاعر رحمان بابا کے صوفیانہ کلام کا منظوم ترجمہ اردو زبان میں کیا جو "متاعِ فقیر" کے نام سے چھپ چکا ہے۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے ان کی ادبی خدمات پر ۲۰۰۷ء میں انھیں صدارتی تمغا برائے حسنِ کارکردگی عطا کیا گیا۔

سبق:۱۶

کلام: رحمان باباؒ
منظوم اُردو ترجمہ: پروفیسر محمد طٰہٰ خاں

اِخلاص

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو رحمان باباؒ کی شخصیت اور فن سے متعارف کرانا۔
- طلبہ کو پشتو ادب کی امتیازی خصوصیات کے بارے میں بتانا۔
- طلبہ کو پاکستان کی علاقائی زبانوں میں صوفیانہ افکار سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ کی اخلاقی تربیت کرنا اور فکرِ رحمان بابا کے آئینے میں اپنے کردار کو سنوارنے کی ترغیب دینا۔

ہم دوشِ ثریا ہے مقامِ اِخلاص
جو ملتا ہے، ملتا ہے غلامِ اِخلاص

گو فرش سے تا عرش سفر ہے دُشوار
طے کرتی ہے بہ یک جُنبشِ گامِ اِخلاص

فانی ہے ہر اک چیز، ہر اک رسم و رواج
باقی ہے مگر ایک، دوامِ اِخلاص

اسلام ہے پابندیِ اخلاص کا نام
اور نام ہے اسلام کا نامِ اِخلاص

صیّاد کو ممکن ہے ہُما ہاتھ لگے
پھیلائے محبت سے جو دامِ اِخلاص

شیرینیِ گفتار پہ حیرت کیسی
ہے گفتۂ رحمانؔ، کلامِ اِخلاص

(متاعِ فقیر)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیجیے۔

(الف) نظم ''اخلاص'' میں انسانی کردار کے کس اعلیٰ وصف کا ذکر کیا گیا ہے؟

(ب) ''ہم دوشِ ثریا'' کا مطلب و مفہوم کیا ہے؟

(ج) اخلاص کا ایک قدم انسان کو کس مقام اور مرتبے تک پہنچا دیتا ہے؟

(د) شاعر نے صیاد کو کس کامیابی کی نوید سنائی ہے؟

(ہ) گفتۂ رحمان کا مطلب کیا ہے؟

۲۔ نظم کے متن کے مطابق مصرعے مکمل کریں۔

(الف) گو فرش سے تا عرش ______ ہے دُشوار

(ب) طے کرتی ہے ______ گامِ اخلاص

(ج) اسلام ہے پابندی ______ کا نام

(د) اور نام ہے ______ کا نامِ اخلاص

(ہ) صیاد کو ممکن ہے ______ ہاتھ لگے

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں۔

(i) نظم اخلاص ترجمہ کی گئی ہے:

(الف) پشتو زبان سے (ب) سندھی زبان سے (ج) بلوچی زبان سے (د) سرائیکی زبان سے

(ii) ہر کوئی غلام ہے:

(الف) دولت کا (ب) محبت کا (ج) اخلاص کا (د) عظمت کا

(iii) دنیا میں دوام حاصل ہے:

(الف) نیکی کو (ب) اخلاص کو (ج) محبت کو (د) جمال کو

(iv) پابندیِ اخلاص نام ہے:

(الف) جہاد کا (ب) قرآن کا (ج) اسلام کا (د) دین کا

(v) اس نظم کی ہیئت ہے:

(الف) غزل (ب) مخمس (ج) مسدس (د) مثنوی

۴۔ پاکستان کی علاقائی زبانوں میں صوفیانہ کلام کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ پنجاب کے کسی بزرگ صوفی شاعر کے چند اشعار کے حوالے سے ان کا تعارف کرائیں۔

۵۔ درج ذیل شعر کی روشنی میں اخلاص کی وضاحت کریں:

صیاد کو ممکن ہے ہُما ہاتھ لگے
پھیلائے محبت سے جو دامِ اخلاص

۶۔ نظم "اخلاص" کا خلاصہ تحریر کریں۔

۷۔ نظم اخلاص میں استعمال ہونے والے مرکبات کے معنی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں۔

سرگرمی برائے طلبہ:

- طلبہ نظم اخلاص کے قوافی کی پہچان کرتے ہوئے، ان کی فہرست ترتیب دیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو اس نظم کے پوشیدہ پیغام سے رُوشناس کرائیں۔
- صوفیانہ افکار کے حامل چند اُردو شعرا سے متعارف کرائیں۔

سیّد محمد جعفری

(۱۹۰۵ء۔۱۹۷۶ء)

طنزیہ ومزاحیہ شاعری میں سیّد محمد جعفری کا نام بہت نمایاں ہے۔ سیّد محمد جعفری بھرت پور (ہندوستان) کے ایک علمی گھرانے میں پیدا ہوئے اور تعلیم کے زیادہ تر مراحل لاہور میں طے کیے۔ ان کے والد سیّد محمد علی جعفری، جو اسلامیہ کالج، ریلوے روڈ، لاہور کے پرنسپل تھے اور تاریخ و فلسفہ کے عالم تھے۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد سیّد محمد جعفری کے سامنے کسبِ معاش کا مسئلہ پیش آیا تو چند دن "زمیندار" سے وابستہ رہ کر صحافت کا شوق پورا کیا اور دو ایک سکولوں کے بعد گورنمنٹ کالج لائل پور (فیصل آباد) میں پڑھایا اور پھر ۱۹۴۰ء میں محکمہ اطلاعات میں انفارمیشن آفیسر بن کر دہلی چلے گئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد پاکستان آ گئے۔ ۱۹۶۴ء میں بحیثیت پریس اور کلچرل اتاشی مقرر ہوئے جہاں سے ۱۹۶۶ء میں ریٹائر ہوئے تو کراچی میں مستقل رہائش اختیار کر لی اور وہیں وفات پائی اور آسودۂ خاک ہوئے۔

سیّد محمد جعفری میں صغر سنی ہی سے مزاح کی حس بہت تیز تھی اور شعر کہنے کا ملکہ بھی فطری طور پر موجود تھا، چناں چہ لڑکپن ہی سے فرضی صورتِ حال کو شعر کے قالب میں ڈھالنے لگے تھے۔ انھوں نے باقاعدہ کبھی کسی سے اصلاح نہ لی البتہ دورانِ ملازمت ان کا دو سال تک قیام لکھنؤ میں رہا تو وہاں ظریف لکھنوی، عزیز لکھنوی اور دوسرے اساتذہ کی صحبت سے فیض حاصل کیا۔ سیّد محمد جعفری، اکبر الٰہ آبادی کے بڑے مداح تھے اور انھیں اُردو کا سب سے بڑا مزاحیہ شاعر سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اکبر الٰہ آبادی کی طرح اُن کی نظموں کا بڑا موضوع بھی تہذیبی تضاد سے دوچار معاشرہ اور اردگرد کا ماحول ہے۔

سیّد محمد جعفری نہایت ذہین مزاح نگار تھے۔ ان کے یہاں مزاح کی لطافت اور شگفتگی زیادہ اور طنز کی تلخی کم ہے۔ وہ معاشرتی کرداروں اور اجتماعی زندگی کی منافقانہ صورتِ حال کو مزاح کے انداز میں عیاں کرتے ہیں۔ ان کی شاعری کے دو مجموعے "شوخیِ تحریر" اور "تیرِ نیم کش" ہیں۔ ان کے انتقال کے بعد ان کا تمام کلام "کلیاتِ سیّد محمد جعفری" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ ان کی نظم "کھڑا ڈنر" مغرب کی دیکھا دیکھی ہمارے معاشرے میں شادی بیاہ کے موقعوں پر کھڑا ہو کر کھانے کے نظام کی صورتِ حال پر لطیف طنز ہے۔

سبق: ۱۷

کھڑا ڈِنر

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو مزاحیہ ادب بالخصوص مزاحیہ شاعری کے بارے میں آگاہ کرنا۔
- سید محمد جعفری کے مزاحیہ کلام کا جائزہ لینا۔
- نظم "کھڑا ڈِنر" میں پیش کردہ منظر کی وضاحت کرنا۔
- طلبہ کو بتانا کہ مغربی تہذیب کی نقالی نے ہمارے رنگ ڈھنگ، نشست و برخاست اور طعام و کلام کو متاثر کیا ہے۔

کھڑا ڈنر ہے غریبُ الدّیار کھاتے ہیں　　بنے ہوئے شُترِ بے مہار کھاتے ہیں
اور اپنی میز پہ ہو کر سوار کھاتے ہیں　　کچھ ایسی شان سے جیسے ادھار کھاتے ہیں
شکمِ غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے
ڈنر کے سائے میں فوجی پریڈ ہوتی ہے

کھڑے ہیں میز کنارے جو ایک پیٹ لیے　　اُنھی نے کوفتے اپنے لیے لپیٹ لیے
اِدھر اُدھر کے جو کھانے تھے سب سمیٹ لیے　　کھڑا تھا پیچھے سو مَیں رہ گیا پلیٹ لیے
یہ میز ہو گئی خالی اب اور کیا ہوگا
"پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا"

تھی ایک مرغ کی ٹانگ اور رقیب لے بھاگا　　مرا نصیب بھی جاگا، پہ دیر میں جاگا
کباب اُٹھایا تو اس میں لپٹ گیا دھاگا　　ڈنر یہ کیا کہ نہ پیچھا ہے جس کا نے آگا
یہ کیا خبر تھی میں آیا تھا جب ڈنر کھانے
"حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے"

وہ ایک میز خواتین گرد صف آرا　　لبوں سے اُن کے رواں گفت گو کا فوّارہ
میں ایک گوشے میں سہا کھڑا ہوں بے چارہ　　کہ یہ ہٹیں تو اٹھاؤں میں نان کا پارہ
اسیرِ حلقۂ خوباں جو مرغ و ماہی ہیں
تو ہم شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی ہیں

(شوخیٔ تحریر)

مشق

۱۔ مختصر جواب دیں:

(الف) ''کھڑا ڈنر'' کون کھاتے ہیں؟

(ب) ''پلاؤ کھائیں گے احباب، فاتحہ ہوگا'' کس شاعر کے کلام سے تضمین کی گئی ہے؟

(ج) مرغ کی ٹانگ کون لے بھاگا؟

(د) ''شترِ بے مہار'' سے کیا مراد ہے؟

(ہ) گفت گو کا فوارہ کن کے لبوں سے رواں تھا؟

۲۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) ''اُدھار کھانا'' اُردو قواعد کی رُو سے ہے:

(الف) ضرب المثل (ب) محاورہ (ج) روزمرہ (د) تلمیح

(ii) فوجی پریڈ ہوتی ہے:

(الف) شجر کے سائے میں (ب) ڈنر کے سائے میں (ج) تلواروں کے سائے میں (د) دیوار کے سائے میں

(iii) مرغ کی ٹانگ لے بھاگا:

(الف) رقیب (ب) حریف (ج) نوجوان (د) بچّہ

(iv) ''آگا، پیچھا'' اُردو قواعد کی رُو سے ہیں:

(الف) ذو معنی الفاظ (ب) مرکب عطفی (ج) متضاد الفاظ (د) مترادف الفاظ

(v) ''حقیقتوں کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے'' کے شاعر کا نام ہے:

(الف) افتخار عارف (ب) شاعر لکھنوی (ج) سلطان خنر (د) باقی صدیقی

۳۔ نظم کھڑا ڈنر میں شاعر نے کس طرح مزاحیہ کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی ہے؟

۴۔ ذیل میں دیے گئے الفاظ وتراکیب کے معانی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں:

غریب الدّیار، شکم، رَقیب، حقیقت، صف آرا، کم نگاہی

۵۔ نظم کے متن کے مطابق مصرعے مکمل کریں:

(الف) کھڑا ڈنر ہے ________ کھاتے ہیں

(ب) ________ غریب کی یوں فرسٹ ایڈ ہوتی ہے

(ج) کھڑے ہیں میز ________ جو ایک پیٹ لیے

(د) کباب اٹھایا تو اس میں ________ گیا دھاگا

(ہ) ________ کو سنبھالے ہوئے ہیں افسانے

رعایتِ لفظی: عبارت یا شعر میں کسی لفظ کو اس طریقے سے استعمال کرنا کہ پڑھنے یا سننے والے کو اس لفظ کے دو مختلف مطالب و مفاہیم کا احساس ہو اور اس سے مزاح کا تاثر بھی پیدا ہو، رعایتِ لفظی کہلاتا ہے۔ جیسا کہ اکبرالہ آبادی نے کہا ہے:

عاشقی کا ہو برا اس نے بگاڑے سارے کام
ہم تو اے بی میں رہے اغیار بی اے ہو گئے

اُردو اور پنجابی کے ممتاز مزاحیہ شاعر انور مسعود نے اپنے بہت سے قطعات میں رعایتِ لفظی سے خوب کام لیا ہے۔ ذیل میں دیا گیا ان کا ایک مشہور قطعہ رعایتِ لفظی کی بہترین مثال کے ساتھ ساتھ ہمارے موجودہ حالات سے مطابقت بھی رکھتا ہے:

جو ضرب بھی لگی ہے وہ پہلے سے بڑھ کے تھی
ہر ضربِ کرب ناک پہ میں تلملا اٹھا
پانی کا، سوئی گیس کا، بجلی کا، فون کا
بل اتنے آگئے کہ میں بلبلا اٹھا

۶۔ نظم "کھڑا ڈنر" کے درج ذیل بند کی تشریح کریں:

وہ ایک میز خواتین گرد صف آرا
لبوں سے اُن کے رواں گفت گو کا فوارہ
میں ایک گوشے میں سہما کھڑا ہوں بے چارہ
کہ یہ ہٹیں تو اٹھاؤں میں نان کا پارہ
اسیرِ حلقۂ خوباں جو مرغ و ماہی ہیں
تو ہم شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی ہیں

۷۔ نظم "کھڑا ڈنر" کا خلاصہ لکھیں۔

۸۔ شاملِ نصاب نظم "کھڑا ڈنر" چار بندوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلے دو بندوں کی ردیف کیا ہے؟ قوافی کی فہرست بھی مرتب کریں۔

سرگرمی برائے طلبہ:

- طلبہ انٹرنیٹ کی مدد سے یا اپنے کالج کی لائبریری سے طنز و مزاح کے کسی اور معروف شاعر جیسے: دلاور فگار، سید ضمیر جعفری، شان الحق حقی وغیرہ کی منتخب مزاحیہ نظمیں تلاش کریں اور اپنی جماعت کے کمرے میں پڑھیں۔

برائے اساتذہ کرام:

- اساتذہ کرام طلبہ کو سید محمد جعفری کی شخصیت سے متعارف کراتے ہوئے ان کی مزاحیہ شاعری کی خصوصیات کے بارے میں تفصیل سے بتائیں۔
- اساتذہ کرام طلبہ کو رعایتِ لفظی کی تفہیم کراتے ہوئے انھیں مختلف نثری اور شعری مثالوں کی مدد سے سمجھائیں۔

حصہ غزل

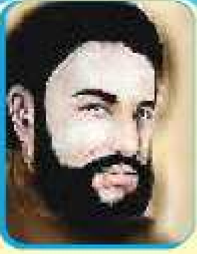

میر تقی میرؔ

(۱۷۲۳ء-۱۸۱۰ء)

میر محمد تقی نام اور میرؔ تخلص تھا۔ آگرہ میں پیدا ہوئے۔ والد سیّد علی تقی ایک درویش منش انسان تھے اور تصوف سے بہت گہرا تعلق رکھتے تھے۔ میرؔ کے والدین ان کے بچپن ہی میں انتقال کر گئے۔

اس سانحہ کے بعد میرؔ آگرہ کو خیرباد کہہ کر دہلی آ گئے۔ دہلی میں اپنی سوتیلی والدہ کے بھائی سراج الدین احمد خاں آرزوؔ (جو خود بھی فارسی کے بہت بڑے عالم، لغت نویس اور شاعر تھے۔) کے پاس ٹھہرے، مگر جلد ہی آگرہ واپس آ گئے۔ کچھ عرصہ آگرہ میں گزارا اور پھر دہلی تشریف لے آئے۔ مختلف اُمرا کے درباروں سے منسلک رہے اور تنخواہ پاتے رہے، مگر وہ زمانہ سخت تباہ حالی اور بدامنی کا تھا، لہٰذا میرؔ صاحب کہیں ٹک کر ملازمت نہ کر سکے۔ بہت سے شعرا سلطنتِ اَوَدھ کی خوش حالی اور آرام طلب ماحول کے باعث لکھنؤ جا کر آباد ہو رہے تھے۔ میرؔ بھی نواب آصف الدولہ کی دعوت پر لکھنؤ چلے گئے مگر وہاں اپنی طبعی خود پسندی کے باعث جلد ہی دربار سے علیحدہ ہو گئے۔ آخری عمر تنگ دستی میں گزری۔ لکھنؤ میں وفات پائی۔ تدفین بھی وہیں ہوئی۔ ان کی قبر کے کتبے پر ان کا یہ شعر کندہ ہے:

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

میرؔ کو "خدائے سخن" کہا جاتا ہے۔ انھوں نے اپنے عہد کی تمام مروّجہ اصنافِ سخن قصیدہ، مثنوی، رباعی، قطعہ، مرثیہ، واسوخت اور غزل میں طبع آزمائی کی لیکن بنیادی طور پر ان کی پہچان غزل گوئی ہے۔ میرؔ کے ذاتی تجربات، ان کے گردوپیش اور خاندان میں جاری صوفیانہ روایت نے ان کی اُردو غزل کو منفرد رنگ بخشا۔ میرؔ کی غزل میں احساس کی شدّت، مشاہدے کی وسعت، سادگیِ بیان، بے ساختگی، رمزوایمائیت، موسیقیت و ترنّم، تجربے کی گہرائی اور قدرتِ ادا کی خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ میرؔ کی عظمت کو بعد کے تمام شعرا نے تسلیم کیا ہے، جیسا کہ مرزا غالبؔ نے کہا ہے:

ریختے کے تمھی استاد نہیں ہو غالبؔ
کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میرؔ بھی تھا

میرؔ کی تصانیف میں چھے دیوان (اُردو)، ایک دیوان (فارسی)، اُردو شاعروں کا ایک تذکرہ "نِکات الشعرا"، ان کی آپ بیتی "ذکرِ میرؔ" (بزبانِ فارسی) اور چند متفرق رسائل شامل ہیں۔

سبق:۱۸

غزل

تدریسی مقاصد:

- طلبہ میں میرؔ کی غزل کے حوالے سے تنقید اور تحسین کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- طلبہ کو شعری اصطلاحات اور صنائع بدائع سے آگاہ کرنا۔
- میرؔ کے عہد کی ثقافت، معاشرت اور تاریخ کو سمجھنا۔
- طلبہ کی تخلیقی، جذباتی، نفسیاتی اور تنقیدی صلاحیتوں کو ابھارنا۔

پتا پتا بوٹا بوٹا، حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے، باغ تو سارا جانے ہے

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہر گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

عاشق سا تو سادہ کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں
جی کے زیاں کو عشق میں اس کے اپنا وارا جانے ہے

چارہ گری بیماریِ دل کی رسمِ شہرِ حسن نہیں
ورنہ دلبرِ ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

مہر و وفا و لطف و عنایت ایک سے واقف ان میں نہیں
اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارا جانے ہے

تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں تلخی کش
دم دار آبِ تیغ کو اس کی آبِ گوارا جانے ہے

(کلیاتِ غزلیاتِ میرؔ)

مشق

ا۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) میرؔ کے نزدیک کون اس کے حال سے واقف نہیں؟

(ب) شہرِ حُسن کی رسم کیا ہے؟

(ج) اس غزل کی ردیف لکھیں اور قوافی کی نشان دہی کریں۔

(د) ''اور تو سب کچھ طنز و کنایہ رمز و اشارہ جانے ہے'' کے مصرعے میں طنز و کنایہ اور رمز و اشارہ کی وضاحت کریں۔

(ہ) میرؔ کے خون کا پیاسا کون ہے اور میرؔ ''آبِ تیغ'' کو ''آبِ گوارا'' کیوں سمجھتے ہیں؟

۲۔ مصرعے مکمل کریں:

(الف) جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے ______ تو سارا جانے ہے

(ب) چارہ گری بیماریِ دل ______ نہیں

(ج) ______ ایک سے واقف ان میں نہیں

(د) اس کے فلک چشمِ مہ خُورکی ______ کا تارا جانے ہے

(ہ) تشنۂ خوں ہے اپنا کتنا میرؔ بھی ناداں

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) عاشق سا تو کوئی اور نہ ہوگا دنیا میں:

(الف) پاگل (ب) دیوانہ (ج) ہوشیار (د) سادہ

(ii) جانے نہ جانے گُل ہی نہ جانے:

(الف) گلستاں تو سارا جانے ہے (ب) باغباں تو ہمارا جانے ہے

(ج) باغ تو سارا جانے ہے (د) گُل چیں تو تمھارا جانے ہے

(iii) رسمِ شہرِ حسن نہیں:

(الف) چارہ گری کرنا (ب) مرہم رکھنا (ج) نظرِ کرم کرنا (د) التفات کرنا

(iv) ''پتا، بوٹا، گُل اور باغ'' کے الفاظ علمِ بیان کی رُو سے ہیں:

(الف) مجازِ مرسل (ب) کنایہ (ج) مراعات النظیر (د) صنعتِ تکرار

(v) تلخی کش سے مراد ہے:

(الف) تلخ بات کہنے والا (ب) کڑوی دوا پینے والا (ج) تلخی کو ناپسند کرنے والا (د) تلخی برداشت کرنے والا

۴۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں۔

تیغ رسم زیاں تشنہ چشم دم دار

۵۔ مندرجہ ذیل تراکیب کے معانی لکھیں:

چارہ گری رسمِ شہرِ حُسن لطف وعنایت

رمز واشارا آبِ گوارا مہ وخور

۶۔ میر کی شامل کتاب غزل کو درست تلفظ، لحن اور آہنگ سے باآوازِ بلند پڑھیں۔

۷۔ درج ذیل شعر کی تشریح فکری اور فنی حوالے سے کریں:

لگنے نہ دے بس ہو تو اس کے گوہرِ گوش کو بالے تک
اس کو فلک چشمِ مہ و خور کی پتلی کا تارا جانے ہے

۸۔ آپ نے میر تقی میر کی غزل پڑھی، آپ کو اس غزل میں سے کون سا شعر پسند آیا ہے؟ پسندیدگی کی وجہ بھی بتائیں۔

۹۔ میر تقی میر کی اس غزل میں سے ایسے شعر کی نشان دہی کریں جس میں "صنعتِ تکرار" کو برتا گیا ہو۔

مصرع: مصرع بامعنی الفاظ پر مشتمل وہ سطر ہے کہ اگر نثر میں ہو تو جملہ یا فقرہ کہلائے گا اور نظم یا غزل میں ہو تو مصرع۔ مصرع کے لیے موزوں ہونا ضروری ہے۔ شعر کے پہلے مصرع کو مصرعِ اولیٰ اور دوسرے کو مصرعِ ثانی کہتے ہیں۔ مثلاً:

ع یارانِ تیز گام نے محمل کو جا لیا

شعر: دو مصرعے، جو ایک ہی وزن کے ہوں اور ایک خیال کو ظاہر کریں، شعر یا بیت کہلاتے ہیں۔ مثلاً:

مری طرح سے مہ و مہر بھی ہیں آوارہ
کسی حبیب کی، یہ بھی ہیں جستجو کرتے

قافیہ: ہر شعر کے آخر میں ردیف سے پہلے آنے والے ہم آواز الفاظ کو قافیہ کہا جاتا ہے۔ مثلاً: غالب نے اپنی ایک غزل میں قوافی باندھے ہیں: ہُوا، دوا، ماجرا، مدعا، خدا، وفا، دعا، صدا وغیرہ۔

ردیف: اصطلاحِ شعر میں قافیے کے بعد آنے والے وہ لفظ یا ایسے الفاظ جو جوں کے توں بار بار دہرائے جائیں، ردیف کہلاتے ہیں۔ مثلاً:

اب تو کچھ اور ہی اعجاز دکھایا جائے
شام کے بعد بھی سورج نہ بجھایا جائے

احمد ندیم قاسمی کے اس شعر میں "جائے" کا لفظ بطور ردیف استعمال ہوا ہے۔

۱۰۔ میرؔ کی اس غزل سے مطلع، مقطع، قافیہ اور ردیف کی مثالیں تلاش کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- میر تقی میرؔ کی اس غزل کے تمام اشعار زبانی یاد کریں اور اپنے ہم جماعت دوستوں کو صحتِ تلفظ، لے اور آہنگ سے سنائیں۔
- انٹرنیٹ سے میر کی غزل پر فلمائی گئی ویڈیو ڈاؤن لوڈ کر کے سنیں، دوستوں سے تذکرہ کریں اور اس کے جمالیاتی پہلوؤں سے محظوظ ہوں۔

ہدایات برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو میر تقی میرؔ کی شخصیت، فن اور ان کے عہد کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی پہلوؤں سے روشناس کرائیں۔
- دورانِ تدریس اور بعد از تدریس طلبہ سے سوانحی حالات کے بارے میں چند سوالات کریں۔
- طلبہ کو میر کے کم از کم زبان زدِ خاص و عام اشعار نوٹ کرائیں۔
- طلبہ سے میرؔ کی غزل گوئی کے بارے میں گفت گو کریں۔

برائے اضافی مطالعہ

جس سر کو غرور آج ہے یاں تاج وری کا
کل اس پہ یہیں شور ہے پھر نوحہ گری کا

آفاق کی منزل سے گیا کون سلامت
اسباب لٹا راہ میں یاں ہر سفری کا

زنداں میں بھی شورش نہ گئی اپنے جنوں کی
اب سنگ مداوا ہے اس آشفتہ سری کا

لے سانس بھی آہستہ کہ نازک ہے بہت کام
آفاق کی اس کارگہِ شیشہ گری کا

ٹک میرؔ جگر سوختہ کی جلد خبر لے
کیا یار بھروسا ہے چراغِ سحری کا

(میر تقی میرؔ)

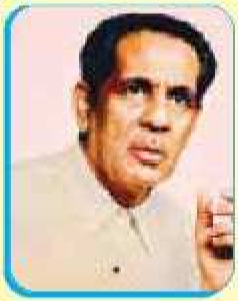

فراق گورکھ پوری

(۱۸۹۶ء - ۱۹۸۲ء)

اصل نام رگھوپتی سہائے جب کہ فراق تخلص تھا۔ گورکھ پور (انڈیا) میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی گورکھ پرشاد ایک تعلیم یافتہ شخص تھے اور ان کا پیشہ وکالت تھا۔ وہ شعر و شاعری میں بھی خاصا شغف رکھتے تھے۔ عبرت ان کا تخلص تھا۔ فراق کی شاعری میں دل چسپی کی بڑی وجہ ان کا گھریلو ماحول بھی کہا جاسکتا ہے جس میں پرورش پاکر انھوں نے شعر و سخن کی دنیا میں بڑا نام پیدا کیا۔

فراق نے ابتدائی تعلیم اپنے گھر پر ہی حاصل کی۔ وہ اُردو، فارسی اور انگریزی ادب کا وسیع مطالعہ رکھتے تھے۔ انھوں نے ۱۹۳۰ء میں انگریزی ادب میں الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایم۔ اے کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا۔ بعد میں شعبۂ تدریس کا انتخاب کیا اور پھر تمام عمر اسی پیشے سے وابستہ رہے۔ غزل کے ساتھ ان کے تنقیدی مضامین اور خطوط نے بھی خاصی شہرت حاصل کی۔ بھارت اور سوویت یونین کی طرف سے ان کی ادبی خدمات پر انھیں اعزازات سے نوازا گیا۔

فراق ایک وسیع المطالعہ شاعر تھے اور ان کی مشرقی و مغربی ادب پر گہری نظر تھی، اس لیے انھوں نے اپنی غزلوں میں ان دونوں تہذیبوں سے بھرپور خوشہ چینی کی ہے۔ مزید برآں انھیں آریائی اور دیومالائی کلچر ورثہ میں ملا تھا۔ چناں چہ اس تجسس اور ذوق نے انھیں مغربی، ایرانی اور ہندوستانی کلچر کا محرم بنا دیا۔ یہی وجہ ہے کہ انگریزی اور فارسی زبانوں اور تہذیبوں کے ملے جلے اثرات نے ان کے ذہن و دل کی گہرائیوں میں اتر کر نئے نئے خیالات پیدا کیے ہیں۔ ان کی غزلوں میں شدید جذباتی کیفیات اور جمالیاتی حسن پایا جاتا ہے۔

فراق نے غزل میں نئے موضوعات متعارف کرائے اور غزل کو حیاتِ نو بخشی۔ فراق گورکھ پوری کی تصانیف میں ''پچھلی رات''، ''چراغاں''، ''گلِ نغمہ''، ''شعلۂ ساز''، ''روحِ کائنات''، ''غزلستان''، ''شبستان''، ''آرزو کی عشقیہ شاعری'' اور ''اُردو غزل گوئی'' شامل ہیں۔ ان کا تمام کلام ''کلیاتِ فراق'' کی صورت میں بھی شائع ہو چکا ہے۔

سبق: ۱۹

غزل

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو فراق گورکھپوری کی غزل کی نمایاں خصوصیات سے آگاہ کرنا۔
- طلبہ میں تخلیقی اور تنقیدی صلاحیتیں پیدا کرنا۔
- طلبہ میں فراق کی غزل میں موجود انسانی جذبات و احساسات کی تفہیم پیدا کرنا۔
- طلبہ کو فراق گورکھپوری کی غزل کے فلسفیانہ پہلوؤں سے آشنا کرنا۔

سر میں سودا بھی نہیں ، دل میں تمنا بھی نہیں
لیکن اس ترکِ محبت کا بھروسا بھی نہیں

دل کی گنتی نہ یگانوں میں، نہ بیگانوں میں
لیکن اُس جلوہ گہِ ناز سے اُٹھتا بھی نہیں

مہربانی کو محبت نہیں کہتے اے دوست!
آہ اب مجھ سے تری رنجشِ بے جا بھی نہیں

ایک مدت سے تری یاد بھی آئی نہ ہمیں
اور ہم بھول گئے ہوں تجھے ایسا بھی نہیں

یُوں تو ہنگامے اُٹھاتے نہیں دیوانۂ عشق
مگر اے دوست! کچھ ایسوں کا ٹھکانا بھی نہیں

ارے صیاد ہمیں گل ہیں ہمیں بلبل ہیں
تو نے کچھ آہ سنا بھی نہیں دیکھا بھی نہیں

منھ سے ہم اپنے بُرا تو نہیں کہتے کہ فراق
ہے ترا دوست ، مگر آدمی اچھا بھی نہیں

(کلیاتِ فراق)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) شاعر کو ترکِ محبت کا بھروسا کیوں نہیں؟

(ب) دیوانۂ عشق کیا کچھ کر سکتا ہے؟

(ج) ''جلوہ گہِ ناز'' سے کیا مراد ہے؟

(د) شاعر صیاد سے مخاطب ہو کر کیا کہتا ہے؟

(ہ) مقطع میں شاعر نے اپنے بارے میں کیا رائے دی ہے؟

۲۔ مصرعے مکمل کریں:

(الف) سر میں ______ بھی نہیں، دل میں تمنا بھی نہیں

(ب) دل کی گنتی نہ ______ میں، نہ بیگانوں میں

(ج) شکوۂ جور کرے کیا کوئی اس ______ سے جو

(د) مہربانی کو ______ نہیں کہتے اے دوست!

(ہ) ہے ترا دوست مگر ______ اچھا بھی نہیں

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) غزل کے پہلے شعر کو کہتے ہیں:

(الف) مقطع (ب) مطلع (ج) حسنِ مطلع (د) مطلعِ ثانی

(ii) ترکِ محبت کا نہیں ہے:

(الف) کوئی انجام (ب) بھروسا (ج) فائدہ (د) اعتبار

(iii) ''یگانوں'' سے مراد ہے:

(الف) بیگانے لوگ (ب) اپنے لوگ (ج) تنہا لوگ (د) منفرد لوگ

(iv) ______ کو محبت نہیں کہتے اے دوست!

(الف) ارزانی (ب) عداوت (ج) شفقت (د) مہربانی

(v) مقطع میں صنعت استعمال ہوئی ہے:

(الف) صنعتِ مبالغہ (ب) صنعتِ تکرار (ج) صنعتِ تضاد (د) صنعتِ مراعات النظیر

۴۔ غزل کو تحت اللفظ کے انداز میں پڑھیں کہ غزل کا رچاؤ اور معنی آفرینی آپ پر کھل جائے۔

۵۔ درج ذیل الفاظ کو اپنے جملوں میں اس طرح استعمال کریں کہ ان کی تذکیر و تانیث واضح ہو جائے:

الفاظ	جملوں میں استعمال
سودا	
تمنّا	
بھروسا	
ہنگامہ	
شوخ	

۶۔ اعراب کی مدد سے تلفظ واضح کریں:

سودا تمنّا عشق جلوہ گہِ ناز صیاد رنجش

مطلع: کسی قصیدے، غزل یا قصیدہ نما نظم کے پہلے شعر کو، جس کے دونوں مصرعے ہم قافیہ و ہم ردیف ہوں، مطلع کہتے ہیں۔

مطلعِ ثانی: مطلع کے بعد اگر ایک اور مطلع آ جائے تو اسے مطلعِ ثانی کہتے ہیں۔ مثلاً: شیخ غلام ہمدانی مصحفی کی ایک غزل کا مطلعِ ثانی ملاحظہ ہو:

دنیا میں جب تلک کہ مَیں اندوہ گیں رہا
دل غم سے اور دل سے مرے غم قریں رہا
(مطلع)

رونے سے کام بس کہ شب اے ہم نشیں رہا
آنکھوں پہ کھنچتا مَیں سرِ آستیں رہا
(مطلعِ ثانی)

مقطع: کسی غزل کے آخری شعر کو، جس میں شاعر اپنا تخلص بھی لاتا ہے، مقطع کہتے ہیں اور اگر شاعر نے تخلص استعمال نہیں کیا تو پھر اسے مقطع نہیں بلکہ محض غزل کا آخری شعر کہیں گے۔ مثلاً: مرزا داغ کی ایک غزل کا مقطع ملاحظہ ہو:

نہیں کھیل اے داغؔ! یاروں سے کہہ دو
کہ آتی ہے اُردو زباں آتے آتے

۷۔ فراق کی اس غزل میں مطلع اور مقطع کی نشان دہی کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- فراق کی غزل "بہت پہلے سے ان قدموں کی آہٹ جان لیتے ہیں" یوٹیوب سے سنیں اور اس کی خصوصیات آپس میں زیرِ بحث لائیں۔
- طلبہ باہم بیت بازی کا مقابلہ کریں۔

ہدایات برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو فنِ غزل گوئی سے متعلق اہم نکات بتائیں۔
- طلبہ میں شعری ذوق پیدا کرنے کی کوشش کریں۔
- فراق کی اس غزل کا فکری اور فنی سطح پر محاکمہ کریں۔

برائے اضافی مطالعہ

غزل کے ساز اٹھاؤ بڑی اُداس ہے رات
نوائے میرؔ سناؤ بڑی اُداس ہے رات
نوائے درد میں اک زندگی تو ہوتی ہے
نوائے درد سناؤ بڑی اُداس ہے رات
سمیٹ لو کہ بڑے کام کی ہے دولتِ غم
اسے یونہی نہ گنواؤ بڑی اُداس ہے رات
اسی کھنڈر میں کہیں کچھ دیے ہیں ٹوٹے ہوئے
اِنھی سے کام چلاؤ بڑی اُداس ہے رات
دو آتشہ نہ بنا دے اسے نوائے فراقؔ
یہ سازِ غم نہ سناؤ بڑی اُداس ہے رات

(فراقؔ گورکھپوری)

منیر نیازی

(۱۹۲۸ء۔۲۰۰۶ء)

ممتاز اُردو شاعر منیر نیازی کا پورا نام محمد منیر خان تھا۔ وہ خان پور، ضلع ہوشیار پور میں پیدا ہوئے۔ صرف دو ماہ کے تھے کہ ان کے والد وفات پا گئے۔ ان کے چچاؤں نے ان کی پرورش کی ذمہ داری نبھائی۔ سات سال کی عمر تک خان پور میں رہے اور پھر خاندان کے ہم راہ خان پور چھوڑ کر ساہیوال چلے آئے۔

منیر نیازی نے پرائمری تعلیم ساہیوال میں حاصل کی۔ اس کے بعد گورنمنٹ ہائی سکول ساہیوال میں داخلہ لیا اور میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ کچھ عرصہ فوج میں ملازمت کی لیکن بوجوہ ملازمت جاری نہ رکھ سکے۔

تعلیمی سلسلہ کا دوبارہ آغاز کیا اور بہاول پور سے ایف۔ اے پاس کیا۔ بعد ازاں دیال سنگھ کالج لاہور میں داخلہ لیا لیکن قیامِ پاکستان کے پُرآشوب حالات میں تعلیمی سلسلہ ایسا منقطع ہوا کہ پھر جُڑ نہ سکا۔ ساہیوال میں ایک اشاعتی ادارے ''اِرْوِنگ پبلشرز'' کی بنیاد رکھی لیکن مالی معاملات کی وجہ سے ادارہ بند ہو گیا۔ شہر میں مجید امجد، انجم رومانی اور صدیق کلیم جیسے شعرا و ادبا سے روابط قائم ہوئے۔ مجید امجد نے ان پر سب سے زیادہ اثرات مرتب کیے۔ لاہور میں آئے تو ان کی شاعری کی خوش بو پھیلتی چلی گئی۔ وہ حلقہ ارباب ذوق کے سیکرٹری بھی رہے۔ لاہور میں ایک اشاعتی ادارہ ''المثال'' قائم کیا لیکن چند کتابیں شایع کر کے بند کرنا پڑا۔

انھوں نے تا عمر شاعری کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھا۔ کچھ فلموں کے گیت بھی لکھے۔ ان کے گیارہ اُردو اور تین پنجابی شعری مجموعے شایع ہو چکے ہیں۔

''تیز ہوا اور تنہا پھول''، ''جنگل میں دھنک''، ''دشمنوں کے درمیان شام''، ''آغاز زمستاں میں دوبارہ''، ''اس بے وفا کا شہر'' شامل ہیں جب کہ تمام کلام ''کلیاتِ منیر نیازی'' کی صورت میں بھی شایع ہو چکا ہے۔ علاوہ ازیں پنجابی شاعری میں ''سفر دی رات''، ''رستہ دسن والے تارے''، ''چار چپ چیزاں'' شامل ہیں۔

۱۹۹۲ء میں انھیں صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی اور کمالِ فن ایوارڈ سے جب کہ ۲۰۰۵ء میں ستارۂ امتیاز سے نوازا گیا۔

سبق: ۲۰

غزل

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو منیر نیازی کی غزل میں پوشیدہ جذبات، احساسات اور تجربات سے متعارف کرانا۔
- غزل اور غزل کی فکری وفنی لوازمات کے بارے میں روشناس کرانا۔
- منیر نیازی کی غزل کے تجزیے اور تشریح کے ذریعے طلبہ کی تخلیقی سوچ اور تخیل کو ترقی دینا۔

بے چین بہت پھرنا، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی ، دہکائے ہوئے رہنا

چھلکائے ہوئے چلنا ، خوش بو لب لعلیں کی
اک باغ سا ساتھ اپنے ، مہکائے ہوئے رہنا

اُس حُسن کا شیوہ ہے ، جب عشق نظر آئے
پردے میں چلے جانا ، شرمائے ہوئے رہنا

اِک شام سی کر رکھنا ، کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں چمکائے ہوئے رہنا

عادت ہی بنا لی ہے تم نے تو منیرؔ اپنی
جس شہر میں بھی رہنا ، اُکتائے ہوئے رہنا

(کلیاتِ منیر نیازی)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) شاعر کی بے چینی، گھبراہٹ اور جذبوں کی آگ دہکانے کی کیفیت کا سبب کیا ہے؟

(ب) منیر نیازی نے خوش بو کے ساتھ تعلق اور وابستگی کو کس طرح بیان کیا ہے؟

(ج) شیوۂ حُسن کیا ہے؟

(د) چوتھے شعر میں شاعر تے حسنِ تعلیل کو برتا ہے، وضاحت کریں۔

(ہ) شاعر نے کس عادت کو اپنا لیا ہے؟ اس جذبے کو تخلیقی سطح پر بیان کریں۔

۲۔ مصرعے مکمل کریں:

(الف) اک آگ سی ______ کی دہکائے ہوئے رہنا

(ب) چھلکائے ہوئے چلنا، خوش بو ______ کی

(ج) اس ______ کا شیوہ ہے جب عشق نظر آئے

(د) اک شام سی کر رکھنا ______ کے کرشمے سے

(ہ) جس شہر میں بھی رہنا، ______ ہوئے رہنا

۳۔ دُرست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) شاعر آگ دہکائے ہوئے رہتا ہے:

(الف) احساسات کی (ب) جذبوں کی (ج) آہوں کی (د) نالوں کی

(ii) لبِ لعلیں کا مطلب ہے:

(الف) موتی کا کنارا (ب) خوب صورت رُخسار (ج) پتلے ہونٹ (د) سرخ ہونٹ

(iii) شاعر کا محبوب ہے:

(الف) شرمیلا (ب) غصیلا (ج) جوشیلا (د) جھگڑالو

(iv) ''اک شام سی'' اور ''اک چاند سا'' میں ''سی'' اور ''سا'' قواعد کی رو سے ہیں:

(الف) استعارہ (ب) مجازِ مرسل (ج) حروفِ تشبیہ (د) مشبہ بہ

(v) اس غزل کا آخری شعر قواعد کے لحاظ سے کہلاتا ہے:

(الف) مطلع (ب) بیت الغزل (ج) مقطع (د) حسنِ مطلع

۴۔ درج ذیل محاورات کے معانی لکھیں اور انھیں جملوں میں استعمال کریں:

الٹے حلقے کرنا، پٹا پانی ہونا، کاغذ کھولنا، غُل مچانا، نو دو گیارہ ہونا

۵۔ مندرجہ ذیل اشعار کی تشریح کریں:

بے چین بہت پھرنا ، گھبرائے ہوئے رہنا
اک آگ سی جذبوں کی ، دہکائے ہوئے رہنا
اک شام سی کر رکھنا ، کاجل کے کرشمے سے
اک چاند سا آنکھوں میں ، چمکائے ہوئے رہنا

۶۔ منیر نیازی کی غزل کے قوافی بالترتیب لکھیں۔

تشبیہ: جب کسی چیز کو کسی مشترکہ صفت کی بنا پر اس کی کیفیت اور صورتِ حال کو مزید پُر تاثیر اور کیف آور بنانے کے لیے کسی دوسری چیز کے مانند قرار دیا جاتا ہے تو اسے علمِ بیان کی اصطلاح میں تشبیہ کہتے ہیں۔ جس چیز کو تشبیہ دیں اسے مشبّہ، جس چیز کے ساتھ تشبیہ دیں اسے مشبّہ بہٖ، وہ صفت جس کی بنا پر تشبیہ دی جائے اسے وجہِ شبہ اور وہ کلمہ یا حرف جو مشبّہ اور مشبّہ بہٖ کو ملاتا ہے، اسے حرفِ تشبیہ کہتے ہیں۔ اس طرح تشبیہ کے چار ارکان ہوئے:

- مشبّہ
- مشبّہ بہٖ
- حرفِ تشبیہ
- وجہِ شبہ

مثلاً: یہ کاغذ دودھ کی طرح سفید ہے۔
اس مثال میں ارکانِ تشبیہ اس طرح ہوں گے:

مشبّہ	مشبّہ بہٖ	حرفِ تشبیہ	وجہِ شبہ
کاغذ	دودھ	کی طرح	سفید

محاورے اور ضرب الامثال کی طرح تشبیہ کو بھی زبان کا زیور سمجھا جاتا ہے اور اس کے استعمال سے کلام میں حسن اور خوبی پیدا ہو جاتی ہے۔ مثلاً یہ تشبیہات دیکھیے:

پتھر کی طرح سخت، چٹان کے مانند مضبوط، شہد جیسا میٹھا، شیر کی طرح بہادر، ریشم کی مثل نرم، دن کی طرح روشن، رات کی طرح تاریک، تلوار کی طرح تیز، خون کی طرح سرخ، کوئلے کی طرح سیاہ، برف کی طرح ٹھنڈا، تیر کی طرح سیدھا، سمندر کی طرح گہرا وغیرہ۔

طرفینِ تشبیہ: مشبّہ اور مشبّہ بہٖ کو طرفینِ تشبیہ کہا جاتا ہے۔

استعارہ: استعارہ کے لغوی معنی عاریتاً یا ادھار لینا کے ہیں مگر اصطلاح میں جب ہم کسی لفظ کو اس کے حقیقی معنوں کے بجائے مجازی معنوں میں اس طرح استعمال کریں کہ اس کے حقیقی اور مجازی معنوں میں تشبیہ کا تعلق ہو تو اسے استعارہ کہتے ہیں۔

استعارہ کے تین ارکان ہوتے ہیں:

(۱) مستعارلہٗ (جس کے لیے استعارہ کیا جائے)

(۲) مستعارمنہٗ (جس سے استعارہ لیا جائے)

(۳) وجہِ جامع (مستعار لہٗ اور مستعار منہٗ میں مشترک صفت)

استعارے میں مستعار لہٗ کا ذکر نہیں ہوتا، یہ اس کا امتیاز ہے۔ اسی طرح مستعار لہٗ اور مستعار منہٗ میں مشترک صفت کا ذکر بھی نہیں کرتے۔ مثالیں:

(۱) کس شیر کی آمد ہے کہ رَن کانپ رہا ہے رَن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

(۲) ماں کہتی ہے: میرا چاند آیا۔

دوسری مثال میں:

بیٹا	مستعار لہٗ	(ذکر نہیں ہے)
چاند	مستعار منہٗ	
خوب صورتی	وجہِ جامع	(ذکر نہیں ہے)

پہلی مثال میں جراٴت و ہمت کے باعث حضرت عباس رضی اللہ عنہ کو شیر کہا گیا ہے لیکن شعر میں ان کا ذکر نہیں ہوا۔ اسی طرح دوسری مثال میں ماں اپنے خوب صورت بیٹے کو چاند کہتی ہے اور بیٹے کا لفظ استعمال نہیں کرتی۔ یہ دونوں مثالیں استعارہ کی ہیں۔

۷۔ منیر نیازی کی غزل کے احساساتی پہلوؤں پر گفت گو کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- منیر نیازی کی یہ غزل زبانی یاد کریں اور غزل گوئی کے مقابلے میں حصہ لیں۔
- اس غزل کے اشعار صحتِ تلفظ، دُرست آہنگ اور حرکات و سکنات و اشارات کے ساتھ پڑھیں۔
- منیر نیازی کی شخصیت اور فنی حوالے سے کسی نامور محقق اور نقاد کی تصنیف کا مطالعہ کریں اور اہم باتوں سے دوستوں کو آگاہ کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو بتائیں کہ منیر نیازی اپنے معاصرین سے کس طرح منفرد حیثیت رکھتے ہیں۔
- منیر نیازی کا کلام سننے کے لیے طلبہ کو کسی مشاعرہ کا انٹرنیٹ لنک بتائیں تا کہ طلبہ کا شعری ذوق بلند ہو۔

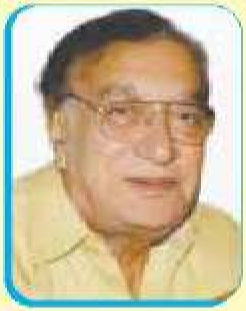

احمد فراز
(۱۹۳۱ء—۲۰۰۸ء)

پاکستان کے نام ور رومانوی شاعر احمد فراز کا اصل نام سیّد احمد شاہ اور تخلص فراز تھا۔ صوبہ خیبر پختون خوا کے شہر نوشہرہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد سیّد محمد شاہ برق بھی فارسی زبان کے ممتاز شاعر تھے۔ احمد فراز ایڈورڈ کالج پشاور میں طالب علمی کے زمانے ہی سے شعر و ادب کی دنیا میں قدم رکھ چکے تھے۔ وہ فیض احمد فیض اور علی سردار جعفری جیسے ترقی پسند شعرا سے بہت متاثر تھے۔

احمد فراز نے پشاور یونیورسٹی سے اُردو اور فارسی میں ایم اے کیا۔ وہ کچھ عرصہ اسی یونیورسٹی میں اُردو زبان و ادب کی تدریس سے بھی وابستہ رہے۔

احمد فراز کی شاعری میں غمِ دوراں اور غمِ جاناں بہ یک وقت ملتے ہیں۔ وہ سماجی ناانصافیوں کے خلاف ہر دور میں بغاوت کا علم بلند کرتے رہے۔ اس کی پاداش میں انھوں نے کئی بار قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

احمد فراز مختلف اہم سرکاری عہدوں پر بھی فائز رہے۔ وہ ادارہ اکادمی ادبیات کے بانی ڈائریکٹر جنرل تھے اور بعد ازاں اس کے چیئرمین بھی رہے۔ اس کے علاوہ نیشنل بک فاؤنڈیشن کے بھی چیئرمین رہے۔

احمد فراز نے شعر و ادب میں بہت کام کیا اور خوب نام کمایا۔ ان کے شعری مجموعوں میں ''تنہا تنہا''، ''جاناں جاناں''، ''دردِ آشوب''، ''خوابِ گل پریشاں ہے''، ''نایافت''، ''شب خون'' وغیرہ شامل ہیں۔ ان کا تمام کلام ''کلیاتِ احمد فراز'' کی شکل میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہو چکا ہے۔

احمد فراز کو ان کی علمی، ادبی خدمات کے حوالے سے متعدد اعزازات سے نوازا گیا جن میں آدم جی ادبی انعام، کمالِ فن ایوارڈ، ستارۂ امتیاز اور ہلالِ امتیاز شامل ہیں۔

سبق: ۲۱

غزل

تدریسی مقاصد:

- طلبہ میں شعروادب کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- طلبہ میں تخلیقی صلاحیتیں کو ابھارنا۔
- طلبہ کے جذبات کی اصلاح کرنا اور فکری بالیدگی پیدا کرنا۔
- طلبہ میں شعر کی تشریح، تفہیم، تجزیہ اور تنقیدی صلاحیتیں پیدا کرنا۔
- طلبہ کو احمد فراز کی شاعری کے مختلف سماجی، ثقافتی اور سیاسی موضوعات سے آگاہ کرنا۔

سلسلے توڑ گیا وہ سبھی جاتے جاتے
ورنہ اتنے تو مراسم تھے کہ آتے جاتے

شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

کتنا آساں تھا ترے ہجر میں مرنا جاناں
پھر بھی اک عمر لگی، جان سے جاتے جاتے

جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

اُس کی وہ جانے، اُسے پاسِ وفا تھا کہ نہ تھا
تم فرازؔ اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

(کلیاتِ احمد فراز)

مشق

۱۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) احمد فراز سلسلۂ دوستی ختم ہونے کے باوجود مراسم رکھنے کی خواہش کس بنیاد پر کر رہے ہیں؟

(ب) دوسرے شعر سے ہمیں کون سا اخلاقی سبق ملتا ہے؟

(ج) شاعر کو ہجر میں مرنا بہ یک وقت آسان اور مشکل کیوں لگتا ہے؟

(د) احمد فراز کا چوتھا شعر انقلابی اور مزاحمتی نوعیت کا ہے، اس کی وضاحت کریں۔

(ہ) آپ کے خیال میں کیا یک طرفہ طور پر وفا کا رشتہ نبھایا جا سکتا ہے؟

۲۔ مصرعے مکمل کریں:

(الف) شکوۂ ــــــــ سے تو کہیں بہتر تھا

(ب) پھر بھی اک ــــــــ جان سے جاتے جاتے

(ج) ورنہ اتنے تو ــــــــ تھے کہ آتے جاتے

(د) جشنِ مقتل ہی نہ ــــــــ ہوا ورنہ ہم بھی

(ہ) تم ــــــــ اپنی طرف سے تو نبھاتے جاتے

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) جاتے جاتے توڑ گیا:

(الف) تعلقات (ب) راہ و رسم (ج) مراسم (د) سلسلے

(ii) اپنے حصے کی جلاتے:

(الف) آگ (ب) موم بتی (ج) اگربتی (د) شمع

(iii) شاعر نے حوصلہ شکنی کی ہے:

(الف) مایوسی کی (ب) اداسی کی (ج) تنہائی کی (د) شکوہ شکایت کی

(iv) اگر جشنِ مقتل برپا ہوتا تو شاعر جاتا:

(الف) ناچتے ہوئے (ب) گاتے ہوئے (ج) گریہ وزاری کرتے ہوئے (د) ناچتے گاتے ہوئے

(v) فراز غزل کے مقطع میں بے وفائی کے بدلے بات کر رہے ہیں:

(الف) بدلہ لینے کی (ب) وفا کرنے کی (ج) بے وفائی کی (د) تعلق منقطع کرنے کی

۴۔ احمد فراز کی اس غزل کا کون سا شعر آپ کو زیادہ پسند ہے؟ وجہ بھی بیان کریں۔

۵۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کے جملے بنائیں:

مراسم ظلمتِ شب جشنِ مقتل پابجولاں پاسِ وفا

۶۔ اس غزل کے قوافی اور ردیف کی پہچان کرتے ہوئے اپنی کاپیوں میں درج کریں۔

۷۔ مندرجہ ذیل اشعار کی فکری و فنی حوالوں سے تشریح کریں:

(الف) شکوۂ ظلمتِ شب سے تو کہیں بہتر تھا
اپنے حصّے کی کوئی شمع جلاتے جاتے

(ب) جشنِ مقتل ہی نہ برپا ہوا ورنہ ہم بھی
پابجولاں ہی سہی ناچتے گاتے جاتے

صنعتِ مراعات النظیر:

وہ صنعت جس کے ذریعے سے شعر میں کچھ ایسے الفاظ لائے جاتے ہیں جو ایک ہی رعایت یا ایک ہی قبیل کے ہوتے ہیں۔ مثلاً:
اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو:

کانپتا ہے دل ترا اندیشۂ طوفاں سے کیا
ناخدا تُو، بحر تُو، کشتی بھی تُو، ساحل بھی تُو

اس شعر میں ناخدا (کشتی کے ملاح)، بحر، کشتی اور ساحل کے الفاظ جمع ہو جانے سے مراعات النظیر کی شرائط پوری ہو گئی ہیں۔

۸۔ احمد فراز کی اس غزل میں ایسے شعر کی شناخت کریں جس میں آپ سمجھتے ہیں کہ صنعتِ مراعات النظیر استعمال ہوئی ہے۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- احمد فراز کی یہ غزل زبانی یاد کریں اور دوستوں کو سنائیں۔
- احمد فراز کی کوئی اور غزل اپنی ڈائری میں لکھیں اور اشعار کا برمحل استعمال کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- طلبہ کو مردّف اور غیر مردّف غزل کا فرق سمجھائیں۔
- طلبہ کو شعری محاسن سے روشناس کرائیں۔
- طلبہ کو غزل کی دیگر شعری اصنافِ سخن سے انفرادیت کے بارے میں بتائیں۔

پروین شاکر

(۱۹۵۲ء - ۱۹۹۴ء)

بیسویں صدی کی ممتاز اُردو شاعرہ کا پورا نام سیّدہ پروین شاکر تھا۔ کراچی میں پیدا ہوئیں۔ پروین شاکر نے رضویہ کالونی سے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور سرسیّد کالج میں داخلہ لیا۔ انھوں نے کراچی یونیورسٹی سے انگریزی زبان وادب میں ایم۔ اے کی ڈگریاں حاصل کیں۔ ۱۹۸۲ء میں انھوں نے سول سروس کا امتحان پاس کیا اور یوں کسٹم اینڈ ایکسائز ڈیپارٹمنٹ میں ڈپٹی کلکٹر کسٹم کے عہدے پر فائز ہوگئیں۔ اس سے پہلے وہ نو سال تک درس وتدریس کے شعبے سے بھی وابستہ رہیں۔

ادبی زندگی میں ان کی سرگرمیاں ۱۹۶۶ء میں اس وقت شروع ہوئیں جب سرسیّد کالج کی بزمِ ادب نے ایک مقابلہ بیت بازی منعقد کروایا۔ یہ پہلا پروگرام تھا جس میں پروین شاکر کی ادبی اور شاعرانہ صلاحیتوں کا اظہار ہوا۔ انھیں گولڈ میڈل دیا گیا۔ پروین شاکر نے بہت چھوٹی عمر میں شاعری اور نثر دونوں میں طبع آزمائی شروع کر دی تھی۔ اُردو اخبارات میں مضامین بھی شائع ہوئے۔

شاعری کے پہلے مجموعے "خوشبو" کو زبردست پذیرائی ملی۔ "صد برگ"، "خود کلامی"، "انکار" اور "کفِ آئینہ" کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان کے کالموں کا مجموعہ "گوشۂ چشم" کے عنوان سے شائع ہوا۔ بعد ازاں ان کی شاعری کلیات "ماہِ تمام" کی صورت میں سامنے آئی۔ پروین شاکر نے غزل کے ساتھ ساتھ آزاد نظم میں بھی طبع آزمائی کی۔ ان کے نمایاں موضوعات محبت، نسوانیت پسندی اور سماجی ذلتیں ہیں۔ وہ اپنے اشعار میں محبت، حسن اور ان کے تضادات کو نئے زاویوں سے پرکھتی اور استعارات، تشبیہات وغیرہ کا عمدہ استعمال کرتی ہیں۔

تتلی، بادل، خوشبو، بارش اور آندھی وغیرہ ان کے معروف استعارے اور علامتیں ہیں۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے انھیں تمغائے حسنِ کارکردگی دیا گیا۔ ۲۶ دسمبر ۱۹۹۴ء کو پروین شاکر کی کار اسلام آباد میں ایک بس سے ٹکرائی جس کے باعث ان کا انتقال ہوا۔ جس شاہراہ پر یہ حادثہ ہوا اُس کا نام پروین شاکر کے نام سے منسوب کر دیا گیا۔

سبق: ۲۲

غزل

تدریسی مقاصد:

- طلبہ کو پروین شاکر کی شاعری میں پائے جانے والی شعری خوبیوں یعنی تشبیہات، استعارات اور زبان کی ندرت کی شناخت، ادبی جمالیات اور شعری حسن کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- طلبہ سے نسوانی اور تانیثی ادب کے بارے میں گفتگو کرنا۔
- طلبہ کو پروین شاکر کی غزل کے مضامین اور موضوعات کے بارے میں بتانا۔

بادباں کھلنے سے پہلے کا اِشارہ دیکھنا
میں سمندر دیکھتی ہوں تم کنارہ دیکھنا

یوں بچھڑنا بھی بہت آساں نہ تھا اُس سے مگر
جاتے جاتے اُس کا وہ مُڑ کر دوبارہ دیکھنا

کس شباہت کو لیے آیا ہے دروازے پہ چاند
اے شبِ ہجراں! ذرا اپنا ستارہ دیکھنا

کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر پسپا ہوئے
اُن ہی لوگوں کو مقابل میں صف آرا دیکھنا

جیتنے میں بھی جہاں جی کا زیاں پہلے سے ہے
ایسی بازی ہارنے میں کیا خسارہ دیکھنا

آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمھارا دیکھنا

ایک مُشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

(ماہِ تمام)

مشق

ا۔ مندرجہ ذیل کے مختصر جواب دیں:

(الف) پروین شاکر کو خوش بو کی شاعرہ کیوں کہا جاتا ہے؟

(ب) ''سمندر'' اور ''کنارہ'' کن دو متضاد صورتوں کی علامتیں ہیں؟

(ج) شاعرہ کے مقابل کون لوگ صف آرا ہوئے ہیں؟

(د) پروین شاکر کے نزدیک جیت جانے میں ہار کا پہلو کس طرح پوشیدہ ہے؟

(ہ) شاعرہ نے آخری شعر میں انسانی بے بسی اور بے ثباتی کا نقشہ کن الفاظ میں کھینچا ہے؟

۲۔ مصرعے مکمل کریں:

(الف) بادباں کھلنے سے پہلے کا ________ دیکھنا

(ب) کیا قیامت ہے کہ جن کے نام پر ________ ہوئے

(ج) جیتنے میں بھی جہاں جی کا ________ پہلے سے ہے

(د) ایک ________ اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے

(ہ) ایسی بازی ________ میں کیا خسارہ دیکھنا

۳۔ درست جواب کی نشان دہی کریں:

(i) شاعرہ دیکھنے کا کہہ رہی ہیں:

(الف) کنارہ (ب) طوفان (ج) سمندر (د) ساحل

(ii) بچھڑنا تھا:

(الف) دشوار (ب) آساں (ج) مشکل (د) قیامت

(iii) دروازے پر آیا:

(الف) چاند (ب) سورج (ج) ستارہ (د) سیارہ

(iv) مقابلے پر وہ لوگ آ گئے جن کے نام پر ہوئے:

(الف) قربان (ب) بدنام (ج) پسپا (د) شکستہ

(v) شاعرہ کے لیے کچھ کم نہ تھی:

(الف) نرگس کی آنکھ (ب) آئینے کی آنکھ (ج) غزال کی آنکھ (د) بیمار کی آنکھ

۴۔ غزل کے درج ذیل اشعار کی تشریح فکری اور فنی حوالوں سے کریں:

(الف) آئینے کی آنکھ ہی کچھ کم نہ تھی میرے لیے
جانے اب کیا کیا دکھائے گا تمھارا دیکھنا

(ب) ایک مشتِ خاک اور وہ بھی ہوا کی زد میں ہے
زندگی کی بے بسی کا استعارہ دیکھنا

۵۔ درج ذیل الفاظ و تراکیب کے معانی لکھیں:

بادباں شباہت صف آرا مُشتِ خاک شبِ ہجراں

۶۔ پروین شاکر کی زیرِ نظر غزل پر ایک استحسانی اور تنقیدی نوٹ لکھیں۔

۷۔ درج ذیل الفاظ پر اعراب لگائیں:

مقابل زیاں آئینہ استعارہ شباہت

۸۔ پروین شاکر کی اس غزل کے قوافی اور ردیف کی نشان دہی کریں۔

سرگرمیاں برائے طلبہ:

- اس غزل کو کمرہ جماعت میں درست تلفظ کے ساتھ بلند آہنگ کے ساتھ پڑھیں۔
- پروین شاکر کی کلیات ''ماہِ تمام'' سکول/کالج کی لائبریری سے جاری کروائیں اور منتخب اشعار ڈائری میں نقل کریں۔

برائے اساتذہ کرام:

- پروین شاکر کے سوانحی کوائف اور شاعری کی منفرد خصوصیات سے طلبہ کو آگاہ کریں۔
- طلبہ کو پروین شاکر کی شاعری اس کے کسی شعری مجموعے سے پڑھ کر سنائیں۔
- طلبہ کو پروین شاکر کی شاعری کے موضوعات کا تعارف کرائیں۔

فرہنگ

(بہ لحاظ الف بائی ترتیب)

فرہنگ میں الفاظ کے بالعموم وہی معانی دیے ہیں جو متن سے مطابقت رکھتے ہیں۔

(۱) حمد

الفاظ	معانی
اُفق	دنیا، آسمان کا کنارہ
بابِ شہود	ظاہر ہونے والا دروازہ
جبل	پہاڑ، کوہ
حرفِ وفا	وفا کا عہد
حشر بپا ہونا	قیامت برپا ہونا، ہنگامہ ہونا
دوام	ہمیشہ ہمیشہ، ہیشگی
رنگِ جمال	خوب صورتی
روش	باغ میں چہل قدمی کا راستہ
سوزاں	جلتا ہوا، بھڑکتا ہو
شانِ جلال	رعب و دبدبہ
شعلہ نوا	گرم گفتار
مرقوم	لکھا ہوا
مکتوم	پوشیدہ، چھپی
موجِ کرم	سخاوت۔ عنایت کی لہر
نجوم بکف	ہاتھوں میں ستارے لیے ہوئے

(۲) نعت

الفاظ	معانی
بزمِ کونین	دنیا اور آخرت کی بزم
بہ صدق و یقیں	سچائی اور یقین کے ساتھ
حزیں	غمگین، دکھی، رنجیدہ
دُرِ ثمیں	بیش قیمت موتی
دسترس	رسائی، پہنچ
دُودمان	خاندان، قبیلہ، کنبہ
زلفِ تاباں	بل کھائے ہوئے بال، چمک دار بال
سرمدی	دائمی، دوامی
سرورِ دلبراں	دوستوں اور محبوبوں کے سردار
شاہد	گواہ جو کسی بات کی تائید یا تردید کرے، محبوب
عالی نسب	اعلیٰ خاندان سے تعلق رکھنے والے
ضو	کرن، روشنی
قابَ قوسین	دو کمان کا فاصلہ، مراد: بہت قریب
قریں	نزدیک
یارا نہیں	جرأت نہیں، ہمت نہیں

(٣) اخلاقِ نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

آب دیدہ ہونا	آنکھوں میں آنسو آنا، آنسو بہانا
اِبہام	پوشیدگی، عدمِ وضاحت
استقامت	پامردی، ثابت قدمی
استقلال	ثابت قدمی، ڈٹے رہنا
اصحابِ صُفّہ	وہ صحابہ کرامؓ جو ایک چبوترے پر قیام کرتے تھے
اہلِ عجم	غیر عرب لوگ، عجمی، ایرانی
پاسِ حیا	حیا کا خیال
تعمیم	عمومیت، عام کرنا
دقیق نکتہ	غور و تحقیق سے سمجھ میں آنے والا نکتہ
ردا	چادر، کملی
سُنَن	سنّت کی جمع
صیغہ	شعبہ، انداز
عُسرت	تنگی، مفلسی
غیر متبدل	تبدیل نہ ہونے والا
فدیہ	خوں بہا، جان کا معاوضہ
فرطِ محبت	زیادہ پیار ہونا
فطرتِ ثانیہ	دوسری فطرت جو مزاج کا حصّہ بن جائے، عادت
گرانی	بھاری پن، بدہضمی
لطفِ طبع	مزاج کی لطافت، عمدہ طبیعت
مداومت	ہمیشہ، استقلال
مقدم	پہلا، اولیت کا حامل
ممولا	ایک پرندہ جس کے پیٹ پر کالی دھاریاں ہوتی ہیں

(٤) فاقہ میں روزہ

افلاس	مفلسی، تنگدستی، غریبی
اوّلِ شب	رات کا پہلا حصّہ
بہ ہزار وقت	بہت مشکل سے
بھادوں	ہندی سال کا چھٹا اور برسات کا آخری مہینا
تاراج ہونا	کسی مقام کا تباہ یا ویران ہونا
تیغ و تفنگ	تلوار اور بندوق
نٹھالی	بے کار، خالی، نکمّا
جواہر نگار	مرصّع، جڑاؤ جس میں جواہرات لگے ہوں
چوپاڑ	چوپال
دال سیو	دال سویّاں
رتھ	دو پہیوں والی بیل گاڑی
زیر و زبر ہونا	الٹ پلٹ جانا
صلاح	مشورہ
گئے بیرا	ہمیں کیا خبر
گئے کام	کیا کام
لہو و لعب	کھیل تماشا
مراقبہ	گیان دھیان، سوچ بچار
مکلّف	پُر تکلف
واگزاشت	قبضہ چھڑانا، آزاد، بحال
ہوائیاں اڑنا	چہرے کا رنگ فق ہونا

(٥) مکاتیبِ غالب

اِحتمال	اندیشہ، امکان
اگال دان	پیک دان، تھوکنے کا برتن
بلادِ شرقیہ	مشرقی ممالک، شہر
پایانِ کار	آخرکار، الغرض
توشہ خانہ	پارچہ خانہ، سٹور

ثمرِ نورس	تازہ پکا پھل مجازاً جوان اولاد
چلمچی	بڑا برتن جو ہاتھ دھونے کے لیے استعمال کیا جاتا ہے
حبسِ دوام	عمر قید
دالان	بڑا اور لمبا کمرہ، صحن، برآمدہ
دید وا دید	میل ملاقات
رُوبکاری	مقدمے کی پیشی
زندان	قید خانہ
زنہار	ہرگز نہیں
صاحبِ فراش	بیمار، علیل، چلنے پھرنے کے قابل نہ ہونا
عالمِ آب وگِل	پانی اور مٹی کا جہان مراد: دنیا
فصد	رگ سے خون نکلوانا
گریزپا	بھاگنے کے لیے تیار، گریزاں
محبس	قید خانہ، زنداں
محل ہے	جگہ ہے، مقام ہے
مسموع	سنا گیا، قبول کیا گیا
مسودات	مسودہ کی جمع، غیر مطبوعہ نسخے
مسہل	قبض دور کرنے والی دوا
ناتواں	کمزور، ضعیف
نہال	پودا، پھل دار درخت
یک قلم	بالکل، یک لخت، فوراً

(۶) ایک اُستادِ عدالت کے کٹہرے میں

احترامِ فائقہ	بہت زیادہ عزت واحترام
بانی	قافیہ دار تعریفی جملے
براجمان ہونا	تشریف فرما ہونا
براڈکاسٹنگ	ریڈیو کے ذریعے سے آواز دور دور پہنچانا
تشنج	اینٹھن، جھٹکے کی بیماری
حکم عدولی کرنا	حکم کی خلاف ورزی کرنا
دیارِ غیر	پردیس، غیر ملک
ریکٹر	وائس چانسلر
سٹی گم ہونا	حواس باختہ ہونا، گھبرا جانا
فارنر	غیر ملکی (Foreigner)
فیوڈل لارڈ	جاگیردار
قیلولہ کرنا	دوپہر کو کھانے کے بعد آرام کرنا
لاابالی طبیعت	غیر سنجیدہ مزاج
ہانک رہا تھا	فضول باتیں کر رہا تھا

(۷) چارپائی

آئی سی ایس	انڈین سول سروس
بگ بُچی	پوٹلی، گٹھڑی
تاملوٹ	پانی پینے کا برتن، گڑوی
توقف کرنا	وقفہ کرنا
جوشاندہ	جوش دی ہوئی دوا، کاڑھا
خوانچہ	چھابڑی
سمن	عدالت میں حاضر ہونے کا تحریری حکم
شکستہ حال	پریشان، خستہ حال
فکرِ سخن	وہ غور و فکر جو شعر کہنے کے واسطے ہوتا ہے
کوچ	گدے دار نشست
گوشۂ چمن	چمن کا کونا
گھٹی میں پڑنا	خمیر یا فطرت میں ہونا
لبِ گور	قبر کے کنارے، مرنے کے قریب
لوازم	لازم کی جمع، ضروری سامان
نقشِ سلیمانی	حضرت سلیمانؑ سے منسوب تعویذ وغیرہ

(۸) اور پاکستان بن گیا

بلکنا	سسکیاں بھر کے رونا، مچل کر رونا
بوکھلانا	بدحواس ہونا
بھرا پُرا گھر	پُر رونق گھر
بے سُدھ	بے خبر
پاؤں نکالنا	حد سے تجاوز کرنا
پٹ کھولنا	دروازہ کھولنا
تار	برقی پیغام، ٹیلی گراف
جوتی پیزار ہونا	پریشان ہونا، بکھر جانا
خون کی ہولی کھیلنا	حد درجہ قتل و خون ریزی کرنا
دام غارت جائیں	پیسے ضائع ہوں
دھیرے سے	آہستہ سے
ڈبڈباتی آنکھیں	آنسو بھری آنکھیں
سر دھڑ کی بازی لگانا	جان پر کھیل جانا، خود کو قربان کرنا
سر سہلانا	سر پر ہاتھ پھیر کر تسلّی کی باتیں کرنا
نڈھال ہونا	کمزور ہونا
نیم دیوانگی	پاگلوں کی سی کیفیت

(۹) نیا قانون

آتشیں بگولا	آگ کا بگولا
آہنی چھت	لوہے کی چھت
بالائی حصّہ	اوپر کا حصّہ
بیاج	سود
بیش تر	زیادہ تر
پیشین گوئی	کسی واقعے کے ظاہر ہونے سے پہلے خبر دینا
تحریک سرخ پوش	باچا خان کی تحریک
تھوتھنی	کسی جانور کا منھ
ٹوڈی بچہ	انگریزوں کا پٹھو، چاپلوس، خوشامدی، غدّار
چشم زدن میں	پلک جھپکنے میں
خلط ملط کرنا	گڈمڈ کر دینا
خیرہ کن	آنکھوں کو چندھیانے والا، حیرت انگیز
درخشاں و تاباں	روشن اور چمک دار
رعونت سے	تکبر اور غرور سے
سوویت اشتراکی نظام	روس میں رائج سوشلزم کا نظام
ششدر و متحیر	حیران ہونا
طوعاً و کرہاً	مجبوراً
عملی تشکیل	عملی صورت، عملی شکل
غیر مرئی	نظر نہ آنے والی
قیاسات	اندازے
کلغی	گھوڑے کے چہرے کا زیور
کوڑھ	جذام، برص کی بیماری
لرزش	کپکپی، خوف
مارواڑی	مارواڑ کا رہنے والا
متانت سے	سنجیدگی سے
مدبرانہ انداز	تدبر اور دانش مندی کا انداز
مکدّر	میلا، آلودہ
ملعون	لعنتی
منہیاری	ایک سٹور جہاں ہر شے کی خریداری کی جا سکتی ہے
ناک میں دم کرنا	بہت تنگ کرنا

(۱۰) دہلیز

آزردگی	رنج، ملال
اثبات میں	ہاں میں
بے چینی	پریشانی
تذبذب	غیر یقینی حالت
تیزگام	تیز رفتار، پاکستان ریلوے کی ایک ٹرین کا نام
جواز	صحیح یا درست ہونا
چکر دینا	دھوکا دینا، فریب دینا
زائل ہونا	دور ہونا، معدوم ہونا
کفارہ	تلافی، بدلہ
لاجواب ہونا	جواب نہ بن پڑنا

(۱۱) تاریخ کا کفن

اُڑتی نگاہ	سرسری نظر
انواع	نوع کی جمع، اقسام
بن مانس	بندر جو انسان سے مشابہ ہوتا ہے
بھانت بھانت کے	طرح طرح کے
تارکول	سڑکوں پر بچھایا جانے والا سیاہ سیال مادہ
تیس مار خانی دکھانا	زبردست دھونس دکھانا
دُرگت بنانا	مارنا پیٹنا
رخنہ ڈالنا	خلل پیدا کرنا
زیر و بم	نشیب و فراز، اتار چڑھاؤ
شہدا	بدمعاش، لفنگا
صلیب	سولی، دار
طویل قامت	دراز قد، قد و قامت میں لمبا
عمل دار	حاکم، عامل
فرش گزیں ہونا	زمیں پر گرنا
فی البدیہہ	فوراً، بغیر توقف
مترنم انداز	گانا گانے کی انداز میں
نحیف و نزار	بہت زیادہ کمزور، لاغر
نووارد	نیا آنے والا
ہلہ بولنا	حملہ کرنا، چڑھائی کرنا

(۱۲) پاکستانی زبانیں اور ان کا باہمی رشتہ

آمیزش	ملاوٹ
استفادہ کرنا	فائدہ اٹھانا
بیش بہا	قیمتی، عمدہ، زیادہ
پاسداری	طرف داری، حمایت، لحاظ رکھنا
پیوست ہونا	دو چیزوں کا باہم مل جانا
تغیرات	تبدیلیاں
تمدن	رہن سہن، طرزِ معاشرت
جھنکار	گھنگھرو، پازیب وغیرہ کی آواز
خدوخال	چہرہ مہرہ، شکل و صورت کی ساخت
لسانی روابط	زبانوں کے باہمی رشتے
لوک ادب	عوامی ادب
مرورِ زمانہ	وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ
مقدور بھر	جہاں تک ہو سکے
وقیع	باوقار، بلند مرتبہ، معزز
ہمہ گیری	وسعت، پھیلاؤ

(۱۳) اے وادیِ لولاب!

بے سوز	رنج اور غم کی کیفیت سے خالی
بے تاب	بے صبر، بے چین
سیماب	پارہ، مراد: بے قرار، مضطرب
صاحبِ ہنگامہ	آواز یا شور برپا کرنے والا مراد جوشیلا
فراست	دانائی، ذہانت، تیز فہمی
فغانِ سحری	صبح کے وقت کی آہ وزاری، فریاد
مرغانِ سحر	صبح کے پرندے
مضراب	موسیقی کے ساز خصوصاً ستار وغیرہ بجانے کا ایک چھوٹا سا آلہ
موقوف	منحصر
مئے ناب	خالص شراب
نایاب	ناپید، بیش قیمت
نواہائے جگر سوز	جگر کو جلانے والی آوازیں

(۱۴) او دیس سے آنے والے بتا

احباب	دوست، پیارے، یار
برکھا	برسات
چاہ	چاہت، محبت، خواہش
ریحان	ایک تیز خوش بودار پودا
سرمست	متوالا، سرشار، مدہوش، کیف و وجد کے عالم میں
سرو	ایک سیدھا لمبا مخروطی شکل کا درخت
غربت	وطن سے دوری، پردیس
کنعان	فلسطین کا قدیم نام جو حضرت یعقوبؑ اور حضرت یوسفؑ کا وطن تھا
گھنگھور گھٹا	سیاہ اور گہرا بادل
گھنیرے	درخت جن کی شاخیں پاس پاس اور بہت سی ہوں، گھرے
مہتاب	چاند، قمر، چاندنی

(۱۵) آزادی

بزم	محفل
پیغامِ عالم گیر آزادی	دنیا بھر کے انسانوں کی آزادی کا پیغام
تاثیرِ آزادی	جذبۂ آزادی کا اثر
تحقیرِ آزادی	آزادی کی توہین
تحیّر	حیرت
تعبیرِ آزادی	آزادی کے خواب کی عملی صورت
تنویر	کرن، روشنی
حشر تک	قیامت تک
ذوقِ ایثار و عمل	قربانی اور عمل کا ذوق و شوق
رہرو	مسافر
زیبِ طاقِ نسیاں	مراد ہے یکسر بھلا دیا جانا
سرخیِ تحریرِ آزادی	پروانۂ آزادی کی جلی سرخی، تحریرِ آزادی کا عنوان
غلام ابنِ غلام	نسل در نسل غلامی
قندیلیں	شمعیں
کتاب اللہ	اللہ کی کتاب، قرآن مجید
گردشِ گردوں	آسمان کی گردش، مراد: زمانے کی گردش

(۱۶) اِخلاص

اخلاص	خلوص، سچی ہمدردی
بہ یک جنبش	ایک ہی اشارے سے
صیّاد	شکاری
فنا ہونا	مٹ جانا
گفتار	گفت گو
گفتۂ رحمٰن	رحمان بابا کا کلام
ہُما	خوش نصیبی کا ایک فرضی پرندہ
ہم دوش	برابر، شانہ بہ شانہ

(۱۷) کھرا ڈنر

اُدھار کھانا	گل جانا، قرض لے کر کھانا
اسیرِ حلقۂ خوباں	حسینوں کی محبت میں گرفتار
رقیب	مخالف، دشمن
سہما ہوا	ڈرا ہُوا
شترِ بے مہار	(مجازاً) بے لگام، بے قابو
شہیدِ ستم ہائے کم نگاہی	بے پروائی کے ستم کے مارے ہوئے
صف آرا	لڑائی کے لیے آمادہ
غریب الدیار	پردیسی، مسافر
فرسٹ ایڈ	ابتدائی طبّی امداد
مُرغ و ماہی	پرندے اور مچھلیاں
نان کا پارہ	روٹی کا ٹکڑا
نَے	(کلمۂ نفی) نہ، نہیں

(۱۸) غزل: میر تقی میر

آبِ تیغ	تلوار کی چمک، دھار
آبِ گوارا	لطیف اور خوش ذائقہ پانی
پُتلی	آنکھ کا گول سیاہ حصّہ
جی کا زیاں	دل کا نقصان، مراد: دل ہارنا
چارہ گری	علاج، درماں
چشم	آنکھ، نظر
دلبر	پیارا
صیّاد	شکاری

(۱۹) غزل: فراق گورکھپوری

ایسوں کا	اس طرح کے لوگوں کا
ترکِ محبت	محبت سے کنارہ کشی کرنا
جلوہ گہِ ناز	محبوب کے نظارے اور دیدار کا مقام
رنجش	ناراضی، کدورت
سودا	جنون
شکیبا	برداشت کرنے والا، صبر کرنے والا
یگانہ	سچا دوست، قریبی ساتھی

(۲۰) غزل: منیر نیازی

اُکتانا	بیزار ہونا
بے چین	بے قرار
دہکانا	آگ بھڑکانا
شیوہ	دستور
لبِ لعلیں	لعل جیسے ہونٹ، سرخ ہونٹ

(۲۱) غزل: احمد فراز

برپا ہونا	منعقد ہونا، قائم ہونا
پابجولاں	مقید، بیڑیاں پہنے ہوئے (مجازاً) چلنے سے معذور و مجبور
پاسِ وفا	وعدے کا خیال کرنا، وفا کا خیال کرنا
جاناں	محبوب، پیارا
ظلمتِ شب	رات کی سیاہی
مراسم	تعلقات

(۲۲) غزل: پروین شاکر

استعارہ	علمِ بیان کی ایک اصطلاح، لفظی معنی: مستعار لینا، قرض لینا، عارضی طور سے مانگ لینا
بادباں	وہ پردہ جو ہوا بھرنے یا ہوا کا رخ بدلنے کے لیے کشتی یا جہاز پر لگاتے ہیں
بنامِ دل	دل کے نام پر
بے بسی	لاچاری
پسپا ہونا	شکست کھانا، پیچھے ہٹنا
خسارہ	نقصان
زد میں	نشانے پر
زیاں	نقصان گھاٹا
شباہت	ملتی جلتی صورت
شبِ ہجراں	جدائی کی رات
صف آرا ہونا	جنگ کے لیے صفیں درست کرنا
مُشتِ خاک	مٹھی بھر خاک، بے حقیقت چیز، مراد: انسان